جلد (۷) عدد ۱
رجب المرجب ۱۳۵۴ھ

رجسٹر نمبر صفحہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صمہ)
قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کیے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے۔ اس مسئلے پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہوگئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لئے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لئے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہ صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت صفحات قیمت بلا جلد (للعہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ۵ انگریزی للعہ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

(یہ کتاب مکتبہ علمیہ چار مینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ رجب ۱۳۵۴ھ - جلد ۷ عدد (۱)

اعلان

اسلام کی تعلیم کو اس کی صحیح فطری صورت میں حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ پھیلانے کی جو کوشش "ترجمان القرآن" میں کی جا رہی ہے، اس کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی اسی طرز کے رسالے جاری کیے جائیں خصوصیت کے ساتھ انگریزی زبان میں ایسے ایک رسالے کی اشاعت بہت ضروری ہے تاکہ دنیائے اسلام کی نئی نسلوں اور مغربی قوموں تک بھی قرآن مجید کی ہدایت کو ایک بین الاقوامی زبان کے ذریعہ سے پہنچایا جا سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس کام کے لیے ہمارے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کو آمادہ کر دیا ہے، جو انگریزی زبان میں ایک اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی ادارت میں عنقریب (Voice of Islam) کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہونے والا ہے جس کے مقاصد اور اصول وہی ہوں گے جو "ترجمان القرآن" کے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی قابلیت سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی ادارت میں یہ رسالہ نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی انگریزی صحافت میں ایک بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔ اور اتنا باوقعت ہوگا کہ اس کے ذریعہ سے جن خیالات اور علوم کی اشاعت کی جائے گی وہ انگریزی خواں پبلک کے دماغوں پر قوت اور وزن کے ساتھ اثر انداز ہو سکیں گے۔

امید ہے کہ آئندہ ماہ شوال (جنوری سنہ ۱۹۳۶ء) تک اس کی اشاعت شروع ہو جائے گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن جن مقاصد کے لیے جاری کیا گیا ہے، وہ محض ایک اردو رسالہ کی اشاعت سے پورے نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے کم از کم ایک بین الاقوامی زبان کو ذریعہ تبلیغ واشاعت بنانا ضروری ہے، تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کے مختلف اقطاع میں، اور دوسری طرف غیر مسلم قوموں میں ہم اپنی دعوت کو پھیلا سکیں۔ جس مرض کا علاج ہم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف ہندوستان اور ہندوستان کے بھی صرف اردو دان لوگوں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک وبائے عام ہے جو ساری دنیا میں پھیل گئی ہے، اور اس نے مسلمانوں کی بھی اکثر وبیشتر قوموں کو گھیر لیا ہے۔ ایک بے چینی ہے جس سے نوع بشری کی روح مضطرب ہو رہی ہے۔ ایک تشنگی ہے جس کو سارا عالم انسانی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ جو غیر مسلم ہیں وہ تو سرے سے جانتے ہی نہیں کہ وہ چشمۂ آب حیوان کہاں ہے جو ان کی پیاس کو بجھا سکتا ہے۔ اور جو مسلمان ہیں وہ اس کو جانتے ہیں مگر اس کو پیتے نہیں یا پی نہیں سکتے۔ اس کے ساقی اصل منبع کو چھوڑ کر ندیوں اور نالوں پر معتکف ہو گئے۔ اس کے دہانے کو جہالت کے پتھروں سے پاٹ دیا گیا۔ اس کے بجائے گندے اور زہریلے پانی کی نہروں کا ایک جال تمام روئے زمین پر پھیل گیا جس کو بعض نادان اب تک آب حیات سمجھ رہے ہیں اور بہت سے دانا محض اس مجبوری سے پیے جا رہے ہیں کہ ان کو آب حیات کا پتہ معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں ایک دو نہیں، بہت سے ایسے منادیوں کی ضرورت ہے جو نہ اتنی

تو اکناف عالم میں خدا کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اس چشمے کی طرف بلائیں جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کی سیرابی کے لیے چھوڑ گئے ہیں، اور صرف بلانے ہی پر اکتفا نہ کریں، بلکہ جو درماندگان راہ اس تک آنے کی قوت نہیں رکھتے ان کے پاس خود اس کا پانی لے کر پہنچ جائیں۔

مشرق ہو یا مغرب، مسلمان ہوں یا غیر مسلم، بلا استثنا سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلط ہو گئی ہے جس نے سراسر مادیت کی آغوش میں پرورش پائی ہے! اس کی حکمت نظری و حکمت عملی، دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا سائنس، اس کے اخلاق، اس کی معیشت، اس کی معاشرت، اس کی سیاست، اس کے قوانین، غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطۂ آغاز سے چل کر ایک غلط رخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے، اور اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آ رہی ہے۔

اس تہذیب کا آغاز ایک ایسی قوم میں ہوا جس کے پاس درحقیقت حکمت الٰہی کا کوئی صاف اور پاکیزہ سرچشمہ نہ تھا۔ مذہب کے پیشوا وہاں ضرور موجود تھے، مگر ان کے پاس حکمت نہ تھی، ان کے پاس علم نہ تھا۔ ان کے پاس خدا کا قانون نہ تھا، محض ایک غلط مذہبی تخیل تھا جو فکر و عمل کی راہوں میں نوع انسانی کو سیدھے رستے پر اگر چلانا چاہتا بھی تو نہ چلا سکتا۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ علم و حکمت کی ترقی میں سد راہ بن جاتا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، اور اس کی مزاحمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ترقی کرنا چاہتے تھے وہ مذہب اور مذہبیت کو ٹھکرا کر ایک دوسرے رستے پر چل پڑے، جس میں عقل، حس اور تجربے کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما نہ تھی۔ یہ ناقابل اعتماد رہنما، جو خود ہدایت اور نور کے محتاج تھے، ان کے معتمد علیہ بن گئے اور ان کی مدد سے انہوں نے فکر و نظر، تحقیق و اکتشاف، اور تعمیر

تنظیم کی راہ میں جتنی سعی و جہد کی، اس کو ہر میدان میں ایک غلط نقطۂ آغاز نصیب ہوا اور ان کی تمام ترقیات کا رُخ ایک غلط منزل مقصود کی طرف پھر گیا، وہ الحاد اور مادّیت کے نقطہ سے چلے انہوں نے کائنات کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے، آفاق اور انفس میں یہ سمجھ کر نظر کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے مشاہدات اور محسوسات کی ہے، اور اس ظاہری پردے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ تجربہ اور قیاس سے انھوں نے قانونِ فطرت کو جانا اور سمجھا، مگر اس کے فاطر تک نہ پہنچ سکے انہوں نے موجودات کو اپنے لیے مسخر پایا اور ان سے کام لینا شروع کیا، لیکن اس تخیل سے ان کے ذہن خالی تھے کہ وہ بالاصل ان اشیاء کے مالک اور حاکم نہیں ہیں، بلکہ اصلی مالک کے خلیفہ ہیں۔ اس جہالت و غفلت نے انھیں ذمہ داری اور جوابدہی کے بنیادی تصورات سے بیگانہ کر دیا، اور اس کی وجہ سے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اساس ہی غلط ہو گئی۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کے پرستار بن گئے، اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے، جو فکر و عمل کے ہر میدان میں ان کو ایسے راستوں پر لیے جا رہی ہے جن کے درمیانی مراحل تو نہایت خوش آیند اور نظر فریب ہیں، مگر آخری منزل بجز ہلاکت کے اور کوئی نہیں۔ وہی ہے جس نے سائنس کو انسان کی تباہی کا آلہ بنا لیا۔ اخلاق کو نفعیت، ریا، خلاعت اور بے قیدی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ معیشت پر سرمایہ داری اور خود غرضی کا شیطان مسلط کر دیا۔ معاشرت کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں نفس پرستی، تن آسانی، اور خودکامی کا زہر اتار دیا۔ سیاست کو قوم پرستی، وطنیت، رنگ و نسل کے امتیازات اور خداوندِ طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت بنا دیا۔ غرض کہ وہ تخمِ خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا، چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجرِ خبیث بن کر اٹھا ہے، جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں، جس کے پھول خوشنما مگر خار دار ہیں، جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں، مگر ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی

اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کیے جا رہی ہے۔

اہل مغرب جنہوں نے اس شجر خبیث کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، اب خود اس سے بیزار ہیں۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش بہت سی نئی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ جس شاخ کو کاٹتے ہیں، اس کی جگہ بہت سی خار دار شاخیں نکل آتی ہیں۔ سرمایہ داری پر تیشہ چلایا تو بولشویت نمودار ہو گئی۔ جمہوریت پر ضرب لگائی تو ڈکٹیٹر شپ پھوٹ نکلی۔ اجتماعی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کا ظہور ہوا۔ اخلاقی مفاسد کا علاج کرنے کے لیے قوانین سے کام لینے کی کوشش کی تو قانون شکنی اور جرائم پیشگی نے سر اٹھایا۔ غرض فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو تہذیب و تمدن کے اس درخت سے نکل رہا ہے، اور اس نے مغربی زندگی کو سر تا پا مصائب و آلام کا ایک پھوڑا بنا دیا ہے جس کی ہر رگ میں ٹیس اور ہر ریشے میں دکھن ہے۔ مغربی قومیں درد سے بیتاب ہو رہی ہیں۔ ان کے دل بے قرار ہیں۔ ان کی روحیں کسی امرت رس کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ مگر انھیں خبر نہیں کہ امرت رس کہاں ہے۔ ان کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجر خبیث کی محض شاخوں میں ہے، اس لیے وہ شاخیں کاٹنے میں اپنا وقت اور اپنی محنتیں ضائع کر رہی ہے، مگر نہیں سمجھتی کہ خرابی جو کچھ بھی ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اصل فاسد سے فرع صالح نکلنے کی امید رکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف ایک قلیل جماعت ایسے صحیح العقل لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے اس حقیقت کو پا لیا ہے کہ ان کے شجر تہذیب کی اصل ہی خراب ہے۔ مگر وہ صدیوں تک اسی درخت کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ہیں اور اسی کے ثمرات سے ان کی ہڈی بوٹی بنی ہے، اس لیے ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس اصل کے بجائے کونسی دوسری اصل ایسی ہو سکتی ہے جو صالح برگ و بار لانے کی قوت رکھتی ہو۔ نتیجہ یہ ہے دونوں جماعتوں کا حال ایک ہی ہے وہ سب کے سب بیتابی کے عالم

کسی چیز کے طالب ہیں، جو ان کے درد کا درمان کرے، مگر انہیں خبر نہیں ہے کہ ان کا مطلوب کیا ہے اور کہاں ہے۔

یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمہاری روحیں بے قرار ہیں، یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے ہو، یہ ہے وہ شجر طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جان بخش بھی جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور روح پرور بھی یہاں تم کو حکمت ملے گی۔ یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ملے گا۔ یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو نظری اور عملی دونوں قسم کے علوم کو ایک مستقیم و مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ ایمان ملے گا جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں بلکہ کارزار دنیا میں جد و جہد کرنے والوں کے لیے سکون قلب اور جمعیت خاطر کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے وہ بلند اور پائیدار قواعد ملیں گے جو انسانی فطرت کے علم حاوی پر مبنی ہیں اور خواہشات نفس کے اتباع میں بدل نہیں سکتے۔ یہاں تم کو تہذیب و تمدن کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات اور اقوام کی نسلی تفریقوں کو مٹا کر خالص عقلی بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں۔ اور عدل، مساوات، فیاضی اور حسن معاملت کی ایک ایسی پرامن اور مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں افراد اور طبقات اور قوموں کے درمیان حقوق کی کشمکش اور متضاد مصالح کے تصادم اور اغراض و مقاصد کی جنگ کے لیے کوئی موقع باقی ہی نہیں رہتا، اور سب کے سب باہمی تعاون کے ساتھ شخصی و اجتماعی فلاح کے لیے خوش دلی اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔ اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہتے ہو تو قبل اس کے کہ تمہاری تہذیب ایک ہولناک صدمہ سے پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ تہذیبوں میں ایک کا اضافہ کرے، تم کو چاہیے کہ اسلام کے خلاف

ان تمام تعصبات کو، جو تمہیں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے وراثۃً ملے ہیں اور جن کو تم نے اس تاریک دور کی تمام دوسری چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں چھوڑا ہے، اپنے دلوں سے نکال ڈالو اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمدؐ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو، سمجھو اور قبول کرو۔

مسلمان قوموں کا حال مغربی قوموں کے حال سے مختلف ہے۔ مرض اور ہے، اسباب مرض بھی دوسرے ہیں، مگر علاج ان کا بھی وہی ہے جو اہلِ مغرب کا ہے یعنی اس علم و ہدایت کی طرف رجوع جس کو اللہ نے اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا ہے وہ ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوئے ہیں۔ رومی فارسی ہندی اور چینی تہذیبیں اس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب وہ اپنے متبعین کی فکری و عملی قوتوں پر پورے زور کے ساتھ حکمران تھا قرآن کا علم ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا، طریقۂ محمدی ان کی زندگی کا دستور العمل تھا، اجتہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کار فرما تھی، روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غالب قوم تھے اور تمام اقوامِ عالم کی پیشوائی کا منصب ان کو حاصل تھا۔ ایسی حالت میں کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی، انہوں نے جس طرف رخ کیا، قوموں کے خیالات، نظریات، علوم، اخلاق و عادات اور طرزِ تمدن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان میں تاثر کی قابلیت کم اور تاثیر کی قوت بہت زیادہ تھی، بلاشبہ انہوں نے دوسروں سے بہت کچھ لیا، مگر ان کی تہذیب کا مزاج اس قدر طاقتور اور مضبوط تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی وہ اس کی طبیعت کے مطابق ڈھل گئی۔ اور کسی بیرونی اثر سے اس میں کوئی مزاج مختلف پیدا نہ ہو سکا۔ بخلاف اس کے انہوں نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے وہ انقلاب انگیز ثابت ہوئے۔ بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں، اور بعض جن میں زندگی

کی طاقت زیادہ تھی، وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے اصول میں بہت کچھ تغیر واقع ہو گیا۔ مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

مسلمان صدیوں تک دنیا میں قلم اور تلوار کے ساتھ فرمانروائی کرتے کرتے آخر کار تھک گئے۔ ان کی روح جہاد سرد پڑ گئی، قوت اجتہاد شل ہو گئی، جس کتاب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی طاقت بخشی تھی اُس کو انھوں نے محض ایک تبرک یادگار بنا کر غلافوں میں لپیٹ دیا، جس ہادی اعظم کی سنت نے ان کی تہذیب کو ایک مکمل فکری و عملی نظام کی صورت میں متشکل کیا تھا اس کی پیروی کو انھوں نے چھوڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ترقی کی رفتار رک گئی۔ بہتا ہوا دریا یکایک جمود کی وادی میں ٹھیر کر تالاب بن گیا۔ امامت کے منصب سے مسلمان معزول ہوئے۔ دنیا کی قوموں پر ان کے افکار، ان کے علوم، اور ان کے تمدن اور ان کے سیاسی اقتدار نے جو قابو پا لیا تھا، اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ پھر اسلام کے بالمقابل ایک دوسری تہذیب نے جنم لیا۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا، جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا، مغربی قوموں نے اٹھا لیا، مسلمان سوتے رہے اور اہل مغرب اس جھنڈے کو لے کر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے، یہاں تک کہ امامت کا منصب جس سے مسلمان معزول ہو چکے تھے ان کو مل گیا۔ ان کی تلوار نے دنیا کے سواد اعظم کو فتح کیا۔ ان کے افکار و نظریات، علوم و فنون اور اصول تہذیب و تمدن دنیا پر چھا گئے، اور ان کی فرمانروائی نے صرف اجسام ہی کا نہیں، دلوں اور دماغوں کا بھی احاطہ کر لیا۔ آخر صدیوں کی نیند کے بعد جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دوسرے اس پر قابض ہو چکے ہیں۔ اب علم ہے تو ان کا ہے۔ تہذیب ہے تو ان کی ہے۔ قانون ہے تو ان کا ہے۔ حکومت ہے تو ان کی ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔

اب اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم ایک دوسرے ڈھنگ پر ہو رہا ہے۔ یقیناً مغربی تہذیب کسی حیثیت سے بھی اسلام کے مقابلہ کی تہذیب نہیں۔ اگر تصادم اسلام سے ہو تو دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتی۔ مگر اسلام ہے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت ہے، نہ اسلامی اخلاق ہیں، نہ اسلامی افکار ہیں، نہ اسلامی اسپرٹ ہے۔ اسلامی روح نہ ان کی مسجدوں میں ہے، نہ مدرسوں میں، نہ خانقاہوں میں۔ عملی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔ اسلام کا قانون نہ ان کی شخصی زندگی میں نافذ ہے نہ اجتماعی زندگی میں۔ تمدن و تہذیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا نظم صحیح اسلامی طرز پر باقی ہو۔ ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افسردہ، جامد اور پس ماندہ تہذیب کا ایک ایسی تہذیب سے مقابلہ ہے جس میں زندگی ہے، حرکت ہے، روشنی علم ہے، گرمی عمل ہے۔ ایسے نامساوی مقابلہ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں، ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں، ان کے دلوں اور دماغوں پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن مغربی سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ ان کی فکری و نظری قوتیں مغربی اصول کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے تصورات، ان کے اخلاق، ان کی معیشت، ان کی معاشرت، ان کی سیاست ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے، اور ان کی نئی نسلیں اس تخیل کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ زندگی کا حقیقی قانون وہی ہے جو مغرب سے ان کو مل رہا ہے۔ یہ شکست دراصل مسلمانوں کی شکست ہے، مگر بدقسمتی سے اس کو اسلام کی شکست سمجھا جاتا ہے۔

ایک ملک نہیں جو اس مصیبت میں گرفتار ہو۔ ایک قوم نہیں جو اس خطرے میں مبتلا ہو۔ آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ درحقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کے اصول و مبانی کو سمجھتے، مغربی

ممالک کا سفر کرکے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی تھی۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کارآمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کر لیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی تھی، اور ان نئے کل پرزوں کو اصول اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کر دیتے کہ کئی صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہونچا تھا اس کی تلافی ہو جاتی، اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علما (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں اتنی صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی علمی وعملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانے کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ اور ہر معاملہ میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے کہ ان کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کر سکتے جب کہ زمانہ بالکل بدل چکا تھا اور علم وعمل کی دنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو چکا تھا جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی تھی مگر کسی غیر نبی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی کہ قرنوں اور صدیوں کے پردے اٹھا کر ان تک پہنچ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ علما نے نئی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کی، مگر مقابلہ کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہ تھا۔ حرکت کا مقابلہ جمود سے نہیں ہو سکتا۔ رفتار زمانہ کو باتوں کے زور سے نہیں بدلا جا سکتا۔ نئے اسلحہ کے سامنے فرسودہ اور زنگ آلود ہتھیار کام نہیں دے سکتے۔ علما نے جن طریقوں سے امت کی رہنمائی کرنی چاہی ان کا کامیاب ہونا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ جو قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں گھر چکی تھی، وہ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر، اور حواس کو معطل کر کے کب تک طوفان کے وجود سے

انکار کرتی اور اس کے اثرات سے محفوظ رہتی۔ جس قوم پر تمدن و تہذیب کا جدید نظام سیاسی طاقت کے ساتھ محیط ہو چکا تھا وہ اپنی علمی زندگی کو غلوبی و محکومی کی حالت میں اس سے کہاں تک بچا سکتی تھی آخر کار وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیے تھا۔ سیاست کے میدان میں شکست کھانے کے بعد مسلمانوں نے علم اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی شکست کھائی اور اب ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دنیائے اسلام کے ہر خطہ میں مغربیت کا طوفان بلا کی تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے جس کی رو میں بہتے بہتے مسلمانوں کی نئی نسلیں اسلام کے مرکز سے کوسوں دور نکل گئی ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ علماء اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے اور اصرار و شدت کے ساتھ قائم ہے جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر، علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں، ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا چاہیے کرا لیجیے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے، کیوں کہ ان کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں، اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر دل سے بے اختیار یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اپنے اردگرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں

سوچتے ہیں، اسی میں رہتے ہیں اور اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں۔ بلا شبہ علوم اسلامی کے جو آثار آج دنیا میں انہی بزرگوں کے دم سے قائم ہیں، اور جو کچھ دینی تعلیم پھیل رہی ہے انہی کے ذریعہ سے پھیل رہی ہے، لیکن دو سو برس کی جو وسیع خلیج انہوں نے اپنے اور زمانہ حال کے درمیان حائل کر رکھی ہے وہ اسلام اور جدید دنیا کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں ہونے دیتی۔ جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلامی تعلیم سے بالکل بیگانہ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے، مگر زندگی کے کسی شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں۔ دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی، ادبی، تمدنی اور سیاسی گاڑی کو چلا رہا ہے، مگر اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف ہے، اسلامی تہذیب کی اسپرٹ سے بیگانہ ہے، اسلام کے اجتماعی نظام اور تمدنی قوانین سے ناآشنا ہے، صرف دل کے ایک گوشہ میں ایمان کا تھوڑا بہت نور رکھتا ہے، باقی تمام حیثیتوں سے اس میں اور ایک غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں، مگر چونکہ علمی و عملی طاقت جو کچھ بھی ہے اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے دست و بازو میں جو گاڑی چلانے کی طاقت رکھتے ہیں، اس لیے وہ ملت کی گاڑی کو لے کر گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کو سیدھا رستہ بتائے۔

ہم اس حالت کو دیکھ رہے ہیں اور اس کا خوفناک انجام ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اگرچہ رہنمائی کے لیے جس علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہے وہ ہم کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکیں، لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے، اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے، اس سے کام لے کر

مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے حقیقی اساس کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیں، اور کامیابی وناکامی سے بے پروا ہو کر اپنی سی کوشش کر دیکھیں۔ کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری کو دیکھ کر اپنی کوششیں خود ہم کو ہیچ میرز معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ بھی ہے اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے، اور اپنی حد وسع تک ہم اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ ڈھائی سال سے اس دعوت کی اشاعت صرف اردو کی تنگ دنیا میں محدود تھی۔ اب خدا کے فضل سے ایک ایسا رفیق کار مل گیا ہے جس نے انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغرب اور مشرق کی وسیع دنیا میں اس دعوت کو پھیلانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو آگے چل کر ایسے ہی اور بہت سے رفقا ہم پہنچ جائیں گے جو دوسری زبانوں میں اس خدمت کو انجام دیں گے۔

مقالات

ورثۂ اسلامیہ کا ایک باب

تصوف اسلام ڈاکٹر نکلسن کی نگاہ میں

(۲)

ترجمہ و تحشیہ جناب ذوقی شاہ صاحب

اسلام میں لوگوں کے اعمال پر حکم لگایا جاتا ہے اور جمہور کے خلاف عقائد کے کسی کے دل میں پیدا ہونے کی روک تھام عام طور پر سزاؤں کے ذریعہ سے نہیں کی جاتی۔ صوفیاء کے عقاید خواہ ظاہر شریعت سے کتنے ہی ٹکرائیں جب تک کہ صوفی اپنے دوسرے مسلمان ساتھیوں کی طرح عبادت کیے چلا جاتا ہے اسے کوئی شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ حلاج ارکان مذہب کی پابندی میں بہت سخت تھا اور اس نے ان ادنیٰ منزلوں کی کبھی تحقیر نہیں کی، گو انھیں کبھی سرا بھی نہیں جن کے ذریعہ سے انسان کو خلوص قلب اور عبدیت (جو کہ حقیقت مذہب ہے) کی بلندی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ یہ اکثر صوفیا کی روش رہی ہے اور دو آقاؤں کی خدمت کرنے کی یہی صورت بہترین بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حلاج کا میلان اپنے ضمیر کا ساتھ دینے پر حد سے بڑھا ہوا تھا۔ فقہا اور حکومت اسلامی کے اقتدار کے مقابلہ میں اس نے اپنے ذاتی اقتدار کو پیش کر دیا جو باعتبار ولی و اہل حق ہونے کے اس نے براہ راست خدا سے اخذ کیا تھا۔ وہ مثل جنید کے صاحب نظریہ ہی نہ تھا بلکہ قرامطہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کا بھی اس پر شبہ کیا گیا تھا اور اس نے اپنے عقائد کی تعلیم مومن و کافر کو یکساں طور پر دینی شروع

کردی تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی تائید میں اس نے اپنی کرامتیں دکھلا دکھلا کر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان وجوہ سے اس کے خلاف ٹھیک فتویٰ ہوا۔ اس کا قصور یہ نہ تھا جیسا کہ صوفیائے متاخرین کہتے ہیں کہ اس نے ربوبیت کا راز فاش کر دیا، بلکہ اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے اندر کی آواز پر عمل کر کے ایک ایسی حقیقت کو ظاہر کر دیا اور اس پر زور دیتا رہا جس سے مذہبی، سیاسی، اور تمدنی شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا۔ دوسرے صوفیوں پر بھی وہ حقیقت منکشف ہوئی مگر حلاج اسی حقیقت کی خاطر جیا اور اسی کی خاطر گیا۔ یہی سبب ہے کہ حلاج کے کلام میں جہاں جہاں کہ اس نے وصل محبوب کی تمنا کی ہے اور اپنی تسلیم و رضا کا اظہار کیا ہے جذبۂ الفت اور تاثیر کا وہ رنگ ہے جو صوفیا کے کلام میں کمیاب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"کہ میرے اور تیرے درمیان "میں" کا حائل ہونا مجھے سخت تکلیف دیتا ہے۔

اپنی مہربانی سے اس "میں" کو درمیان سے نکال دے"

"میں وہ ہوں اور وہ میں ہے ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں بستی ہیں۔
اگر تو نے مجھے دیکھا تو گویا تو نے اُسے دیکھا اور اگر تو نے اُسے دیکھا تو تو نے ہم دونوں کو دیکھ لیا۔"

یہاں ضمناً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان خیالات کا ظاہر کرنے والا یونانی فلسفیوں کا سا "ہمہ اوست" کہنے والا (Pantheist) نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو جیلی (یعنی حضرت عبدالکریم جیلی رح) نے ان توحیدی الفاظ میں ظاہر کیا ہے :۔ "ہم ایک ہی روح ہیں جو دو جسموں میں بستے ہیں"۔ اور جلال الدین رومی کہتے ہیں کہ :۔ "کس مسرت کی وہ ساعت ہے جبکہ ہم دونوں یعنی تو اور میں ایک ہی محل میں بیٹھے ہوں جسم دو ہوں۔ صورتیں دو ہوں۔ مگر روح تیری اور میری ایک ہی ہو"۔

حلاج کا بعض اوقات معنیٔ خاص کے ساتھ یہ کہد ینا کہ میں خدا ہو گیا ہوں اور ساتھ ہی اس کے خدا کے منزہ و برتر و رفیع الدرجات ہونے پر بھی پوری قوت سے زور دینا ایسے شخص کو تعجب میں نہیں ڈال سکتا جس کا کہنا یہ ہو کہ بادی النظر میں منطقی محالات تصوف میں جا کر حقائق ثابتہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ حلاج کے ابتدائی اصول حلاج کے بعد زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے تاہم ذہنیت مابعد کے لیے وہ بنیاد بن گئے۔ مثال کے طور پر انسان کامل کے متعلق اس تخیل کو لو جو ابن عربی کی تصانیف اور تصوف کی فارسی شاعری میں اس قدر غالب ہے۔ مگر ان چیزوں کے مطالعہ سے حلاج کی خصوصیات کا پتہ نہیں چلتا نہ اُس کی اس ذاتی ماہیت کا حال معلوم ہوتا ہے جس کی جانب اُس نے اس مشہور اور بہت ہی مستعمل شعر میں اشارہ کیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

حلاج کی وفات کے بعد کی صدی اگرچہ دیگر اعتبارات سے اس قدر نتائج خیز ثابت نہیں ہوئی تاہم اس دور میں تصوف پر باقاعدہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مثلاً ابو النصر سراج کی کتاب اللمع اور ابو طالب مکی کی قوت القلوب جن کے ذریعہ بہت قیمتی معلومات جن کا ماخذ ضائع ہو چکا ہے محفوظ چلی آرہی ہیں۔ اس زمانہ میں تصوف نے فلسفہ یونانی کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر اسلام سے ہٹنا اور یونانی فلسفیوں کے ہمہ اوست (Pantheism) اور شریعت سے آزادی اور بالخصوص عقیدۂ صدور (Emanation) کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ اس کی بیّن مثال ایرانی صوفی ابوسعید ۹۶۷-۱۰۴۹ء کے سوانح اور کلام میں ملتی ہے۔ بعض اعتبارات سے ان کی تعلیم قابل تعریف ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ :-

"سچا ولی لوگوں میں آتا جاتا رہتا ہے، اُن کے ساتھ کھاتا پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے، بازار

میں جاکر خرید و فروخت کرتا ہے، شادی بیاہ کرتا ہے، خلق سے ملاجلا رہتا ہے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے، اللہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بھولتا"۔

انہوں نے تمام مخلوق کو "خالق کی آنکھ" سے دیکھا اور فیاضی اور شفقت کے برتاؤ کو اس قدر اہمیت دی کہ ان کے نزدیک خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں کہ ایک مسلمان کا دل خوش کر دیا جائے۔ انہوں نے شریعت سے ولی کے تعلق کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اُس کا مقابلہ حلاج کے اقوال و افعال سے کیا جائے تو بلحاظ معنی و بلحاظ عمل بہت فرق معلوم ہوگا۔ حلاج نے حتی الوسع پابندی شرع کی پوری کوشش کی یہاں تک کہ اسے اس لاینحل معرکہ سے سابقہ پڑا جس میں تعمیل شرع کا مقابلہ ان احکام کی تعمیل سے تھا جو وہ حاکم برتر کی جانب سے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ برعکس اس کے ابو سعید کے نزدیک شریعت کی پابندی اُن کے لیے تو لازمی ہے جو روحانی منازل میں ہوں لیکن اُن کے لیے غیر ضروری ہے جو مقصود تک رسائی پا چکے ہوں۔ اُن کے نزدیک وصول الی اللہ (کبھی کبھی) یا باری باری سے ہونے کی چیز نہیں بلکہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا وہ ایک مستقل اور دائمی نتیجہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مریدوں کو حج کعبہ سے منع کر دیا تھا اور خانہ کعبہ کو حقارت سے "ایک پتھر کا مکان" کہا تھا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اذان سن کر انہوں نے اپنا رقص درویشی موقوف نہ کیا اور کہا کہ "ہماری یہی نماز ہے"۔ یہ واقعات حرفاً حرفاً صحیح نہ بھی ہوں تب بھی یہ نمونے کا کام دیتے ہیں۔ مشہور رسالہ قشیریہ میں جو ۴۳۵ء میں تصنیف ہوا تھا قدیم طرز کے متبع سنت صوفیوں کے زہد و تقویٰ کا مقابلہ مصنف نے اپنے زمانہ کے صوفیوں کی بے شرعی اور منافقت سے کیا ہے۔ اس زمانہ کے بھی تیس۳۰ سال بعد صاحب کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ ان کے ہمعصروں نے شہوت کا نام شریعت، توہمات لایعنی کا الہام، نفسانیت و بہیمیت کا نام عشق الٰہی، بدعت کا نام فقر، شبہات کا نام تصفیہ قلب، اور مذہب اصلی سے انکار کا نام

ترک و تجرید رکھ لیا ہے۔ جب کہ اولیاء اور ان کے بے شمار معتقدین و متبعین کی جماعت تاریخ و روایات اسلامی کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی، علماء کے گروہ میں تنازعات باہمی پھیل رہے تھے اور وہ یا تو محض کوتاہ فہمی اور تعصب سے قرآن کے الفاظ ظاہری کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے یا فروعات فقہیہ میں الجھ رہے تھے یا خشک عقل کی روشنی میں اصولی عقاید کے تجزیہ کے درپے تھے اور مذہب کو حقیقتاً مذہب بنانے والی باتوں سے جو کہ مذہب کی جان ہیں سرعت کے ساتھ بے تعلق ہوتے جاتے تھے۔ بہت جوشیلے مسلمان اس وقت اپنے دل میں یہ سوال کرتے ہوں گے کہ یہ حالات کب تک قائم رہیں گے اور کوئی ایسی صورت بھی ممکن ہے جو مذہب کی اصلیت کو تو قائم رکھے مگر لوگوں میں پھوٹ نہ پڑنے دے۔ اس سوال کا جواب ایک ایسے شخص کے درمیان میں آجانے سے مل گیا جو اسلام کے سب سے بڑے لوگوں میں سے ہے اور جس کا نام ابوحامد غزالی ہے (سنہ ۱۰۵۸-۱۱۱۱ء) اور جو زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں ابوحامت (Abuhamet) اور الغزل (Algezel) کے نام سے مشہور ہے۔

غزالی کے صوفی بننے کا قصہ جو انہوں نے خود قلمبند کیا ہے اپنے طرز کی ایک نہایت ہی عالمانہ تحریر ہے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا کہ وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں نکی طبیعت کے تھے تصوف کے مشاہدات نے اُن کے اس مرض کا ازالہ کر دیا فلسفہ اور علم کلام میں ان کے تجربے نے انہیں اطمینان دلا دیا کہ ان علوم سے اطمینان پیدا کرنے والی روشنی مفقود ہے۔ دیگر فرقوں کی تعلیمات سے بھی مطلب براری نہ ہو سکی۔ تب انہوں نے اس تصوف کی جانب توجہ کی جو حارث محاسبی اور تیسری صدی کے صوفیائے اکابرین فن لکھ گئے تھے اور اس سے ان پر حقیقت منکشف ہو گئی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جو امور صوفیا کے لیے مختص ہیں وہ کتابوں کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ عمل اور کیوف اور اندرونی انقلابات ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، یعنی با الفاظ دیگر صوفیوں کی روش اختیار کرنے اور ان کے سے اعمال پر کاربند ہونے سے وہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں[۱]۔ انہوں نے

[۱] مگر پروفیسر نکلسن عبارت کتابوں کے مطالعہ ہی سے سمجھتے ہیں کہ ان میں وہ بصیرت پیدا ہو گئی کہ صوفیا کے اقوال و افعال پر صحیح تنقید کر سکیں

ذوقی

یہ بھی دیکھا کہ ان کی نجات خطرہ میں ہے۔ دنیا کی شان وشوکت حاصل کرنے کا انہیں بہت اچھا موقع تھا۔ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے میں انھیں سخت کشمکش سے سابقہ پڑا۔ اس کشمکش میں ان کی صحت تک خراب ہوگئی۔ مگر بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور مثل اس شخص کے جسے مصائب شدید میں کوئی دوسرا سہارا انہیں ملتا انہوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈ لی۔ ان کی عمر چالیس برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انہوں نے بغداد اس قصد سے ترک کر دیا کہ پھر کبھی وہاں واپس نہ ہوں گے۔

حاصل یہ کہ حقیقت صوفیا ہی کے پاس نکلی اور اس حقیقت کے متعلق غزالی کے ذاتی تجربہ اور ان کی تصانیف بالخصوص احیاء العلوم نے ان لوگوں میں بھی جو کہ اس وقت تک تصوف کے خلاف تھے تصوف کی موافقت میں ایک جوش عظیم پیدا کر دیا، اس زمانے کے بعد سے صوفیا بھی قطعی طور سے اسلام میں داخل سمجھے جانے لگے۔ کیونکہ غزالی اور ان کے بعد بکثرت مسلمانوں کے نزدیک جو انکشافات کہ اولیاء اللہ کو ہوتے ہیں وہ پیغمبروں کے انکشافات ہی کی تائید میں ہوتے ہیں اور پیغمبروں کے انکشافات سرچشمہ ہیں جملہ علوم حقائق کے۔ مگر ساتھ ہی اس کے غزالی اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ ولایت ماخوذ ہے نبوت سے[1] اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور ان کے احکامات کی ظاہری و باطنی تعمیل سب پر فرض ہے۔ اور گو غزالی کا یہ عقیدہ کہ روح ایک آئینہ ہے جس میں قدسی چنگاری سے روشنی پیدا کی گئی ہے اور جس میں اللہ کی ذات و صفات منعکس ہیں زیادہ دلیر صوفیوں کو خلاف شرع جسارتوں پر ابھار سکتا ہے مگر غزالی اپنی ذات سے اس خطرہ سے محفوظ رہے شاید ان کے دل میں جو خیالات مخفی ہوں وہ اُن خیالات سے بڑھے ہوئے ہوں جن کا انہوں نے اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے۔ گو انہوں نے مشکوٰۃ الانوار میں اس قسم

[1] در اصل ایک نبی کی نبوت اُس کی ولایت سے ماخوذ ہوتی ہے اور دوسرے اولیاء کی ولایت اس نبی کی نبوت سے ماخوذ ہوتی ہے جس کے وہ زیر قدم ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجموعہ ہیں جملہ انبیا کی نبوت و ولایت کی نسبتوں کا (ذوقی)۔

کے فقرے بھی لکھے ہیں کہ :- "اللہ آفتاب ہے اور آفتاب کے علاوہ جو کچھ ہے وہ آفتاب ہی کی روشنی ہے"۔ مگر اسلام میں یونانی ہمہ اوستی (Pantheistic) زبان کے استعمال سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس زبان کا استعمال کرنے والا بھی یونانی ہمہ اوستیہ (Pantheist) ہو۔ غزالی کبھی کبھی توحید کے مسئلہ کو انتہائی حدود تک لیجاتے ہیں مگر ساتھ وہ اس کے اعادہ سے بھی نہیں چوکتے کہ خدا خالق ہے جس نے محض اپنے ارادہ سے کائنات کی تخلیق فرمائی تصوف کا ان پر جتنا بڑا احسان تھا۔ اُس کا حق بھی انہوں نے پوری طرح ادا کر دیا۔ اکثر صوفیا کا یہ بھی خیال ہے اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کہ غزالی اتنے زیادہ صوفی نہ تھے جتنے کہ وہ وسیع الخیال مسلمان تھے ان کے سچے زہد و تقوی اور اخلاقی بلندیوں اور سنت پر استحکام نے انھیں اسلام میں راسخ کر دیا تھا۔ اور گو اس بات کو وہ لوگ نہ مانیں مگر بات یہ ہے کہ اُن کی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی نے انھیں پختہ بنا دیا تھا[۱]۔ تصوف کو مذہب اصلی بنا دینے میں تو اُن کو اتنی زیادہ کامیابی نہ ہوی اور یہ امر مشکل بھی تھا۔ مگر اصلی مذہب کو تصوف بنا دینے میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی انھوں نے اس تحریک میں قدامت پسند لوگوں کی ایک قوی جماعت کو گھسیٹ لیا اور اس جماعت نے اس طوفانی دور میں جو کہ آنے والا تھا بڑی روک تھام کی۔ مگر اس کے بعد اس تحریک کو چلانے والی قوت ایک دوسری جانب سے آنی شروع ہوی اور جن خیالات نے اب ہجوم کیا اور اس تحریک کو بڑھا لیا اور آیندہ کے لیے تسلط پا لیا وہ غزالی کے خیالات سے مختلف تھے۔ فرقہ ہاے حدید کے متبعین رسول اس واقعہ پر پردہ نہیں ڈال سکتے کہ ان کا روحانی وطن مکہ نہیں بلکہ ایتھنس اور سکندریہ ہے[۲] تصوف کی تاریخ میں غزالی کے ساتھ ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک صوفیوں کے نزدیک خدا اور روح کے درمیان الفت ذاتی کا رشتہ تھا جو اس رسمی عبادت کے برعکس ہے جو خوف و حکومت کے تحت کیجاتی ہی اس رشتۂ الفت کے ساتھ انہوں نے ان الہیات کو شامل کر لیا جو قدرے

[۱] مگر امام غزالی رح تو یہ فرماتے ہیں کہ علمی تصوف نے ان میں پختگی پیدا کی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی تو ان میں پہلے بھی موجود تھی مگر کسی کام نہ آئی
[۲] میرا تمہیدی نوٹ ملاحظہ ہو۔ (ذوقی)۔

قرآن سے ماخوذ تھیں اور قدرے ارسطو اور اشراقیین یا نو فلاطونیوں (Neo-Platonists) سے جوں جوں اسلام کا تسلط کمزور ہوتا گیا خارجی عناصر قوت پکڑتے گئے حتیٰ کہ بربادی خلافت نے اُن خارجی عناصر کو میدان کا پورا مالک بنا دیا نتیجۃً فلسفۂ ہمہ اوست یونانی (Pantheistic Philosophy) کی صورت میں برآمد ہوا جو اب سات سَو برس کے بعد بھی اسلامی دنیا کے بڑے حصہ پر حکمران ہے اور جیسے جلال الدین رومی، حافظ اور دیگر ایرانی صوفی شعراء نے بیان کر کرکے بکثرت لوگوں کو گرویدہ بنا لیا ہے گو یہ لوگ اس مسلک کے اصلی مصنف اور ابتدائی موجد ابن العربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰ء) کی تصانیف کو سمجھ نہ سکیں۔ ان امور کے متعلق کچھ کہنے سے قبل آؤ ذرا ہم اس زمانہ کی دوسری خصوصیت پر بھی غور کرلیں۔ بارہویں صدی (عیسوی) میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی اس وسیع تحریک و تنظیم کا آغاز ہوا جو زمانہ وسطیٰ کی عیسائی دنیا کے راہبوں کے سلسلوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس سے قبل مشہور مشائخ اپنے مریدوں کو اپنے پاس جمع کرتے تھے اور مریدین کی یہ جماعتیں بعض اوقات خانقاہوں میں سکونت اختیار کرتی تھیں۔ مگر ان مختلف تعلیمگاہوں میں کسی قسم کا ربط باہمی نہ ہوتا تھا۔ اور یہ خانقاہیں جلد یا بدیر بند ہو جایا کرتی تھیں۔ طالبوں کی مفت تعلیم پانے والی ان جماعتوں کے بجائے جن میں شیخ کی ذاتی توجہ سے فیضان پہنچایا جاتا تھا۔ اب سلسلے قائم ہوگئے ہر سلسلہ میں اولیاء کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے جو پیغمبر صاحب سے شروع ہوکر بانی سلسلہ پر ختم ہوتی ہے۔ ان مختلف سلاسل میں دستور العمل بھی مختلف ہوتا ہے، اصول بھی مختلف ہوتے ہیں، اور شریعت کی جانب میلان میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ داخل سلسلہ ہونے کے لیے بالعموم تجرد کی شرط نہیں ہوتی اور گو ان سلسلوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں مگر زیادتی کے ساتھ بالخصوص غرباء ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ ہر نیک و بد میں ان لوگوں کا دوسروں پر بڑا اثر ہوتا ہے بعض یورپین مستشرقین نظری ہمہ اوست Theoretical Pantheism اور عملی بد اخلاقی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر مشرقی طبائع کو ان مبتدیانہ تطبیقات کے تحت میں نہیں

لایا جا سکتا۔ صوفیوں کا ہمہ اوست عملی زندگی میں خدا کی ہستی اور خدا کے احکام کی تعمیل کی ضرورت پر مشتمل ہے گو اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام میں مستند مسلمات اصولی نہ ہونے کی بنا پر صوفیوں کو ایک آزادی حاصل ہے جس کا ان میں سے اکثر غلط استعمال کرتے ہیں [۱]

محی الدین ابن عربی جو گروہ صوفیا میں پرواز تخیل کے سب سے بڑے استاد ہیں ملک اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ء میں دمشق میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا فلسفہ کائنات ضخیم ضخیم مجلدات میں موجود ہے۔ جن میں مشہور ترین تصانیف فتوحات المکیہ اور فصوص الحکم ہیں ان تصانیف کا بڑا حصہ ادق [۲] اور ظنی ہے۔ تاہم ان کا مطالعہ کرنے والوں میں سے کوئی شخص بھی مصنف کی دماغی اور تخیلی قوت پر حیرت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ گو بعض لوگوں مثلاً عبد الکریم جیلی (سنہ ۱۴۱۷ء) نے ان ہی باتوں کو زیادہ وضاحت اور زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل خاکہ میں صرف چند اہم نکات ہی کو لیا جاتا ہے :۔

ابن العربی پکے موحد ہیں اور ان کے مسلک کو وحدت الوجود کا جو نام دیا گیا ہے وہ صحیح طور پر اس مسلک کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جملہ اشیاء کا وجود خیالی پہلے سے علم الٰہی میں موجود تھا۔ اس سے یہ اشیاء نکلیں اور وہیں مراجعت کریں گی نفی محض سے خلقت وجود میں نہیں آئی بلکہ کائنات ظہور ہے اس کا جو باطناً خدا ہے۔ ہر چیز کسی نہ کسی صفت الٰہی کا مظہر ہے اور انسان عالم صغیر ہے جس میں جملہ اسماء وصفات کا اجتماع ہے اور صرف انسان ہی میں خدا پوری طرح اپنے سے باخبر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ

---

[۱] مسائل صوفیا اور صوفیوں کی مفروضہ آزادی عمل کے متعلق بھی پروفیسر نکلسن کو متعدد غلط فہمیاں واقع ہوئی ہیں جن کا ازالہ ایک مستقل مضمون مانگتا ہے۔ (ذوقی)۔

[۲] اس کا کیا ثبوت ہے کہ محی الدین ابن عربی رح نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا وہ ظنیات اور پرواز تخیل کے تحت میں ہے؟ کیا اس کا بھی ثبوت ہے کہ کشف والہام پروفیسر نکلسن کے فہم سے بالاتر امور ہیں؟ کیا جو چیز پروفیسر صاحب کی عقل سے ماوراء ہو اس کا وجود ہی محال ہے؟ ابن عربی رح کی تحریریں بھی پروفیسر صاحب کے فہم سے بہت ارفع ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون میں ان تحریروں کا خلاصہ بالکل غلط دیا ہے اور ابن عربی رح کی تحریروں کی باریکیوں کو وہ بالکل نہیں سمجھتے (ذوقی)۔

جیسیں کہ ناسٹک (Gnosticism) اشراقیت (Neo-Platanism) عیسائیت
اور دیگر مخارج سے اجزا رکو لے کر شامل کیا گیا ہے ابن العربی کے مسلک میں نہایت مرکزی حیثیت اختیار
کیے ہوئے ہے۔ یہ لب لباب ہے اصول تخلیق کائنات کا۔ الہیت کو ایک شئے خارجی قرار دے کر اصلی انسانی
تخیل میں ظاہر کیا گیا ہے جس کا پہلا جسدی اوتار آدم ہے۔ انسان کامل خدا کی صورت و فطرت کا
نمونہ ہے اور رحمت الٰہی اور تنظیم کائنات کے درمیان واسطہ ہے جس کے ذریعہ سے دنیا زندہ اور
قائم رکھی جاتی ہے۔ اور لازمی طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدرجہ اتم انسان کامل ہیں۔ ابن العربی
سے بہت پہلے ہی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی کی قدامت کا عقیدہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ سب سے
پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی سمجھا جاتا ہے کہ نور محمدی ہے جو آدم میں آیا اور نسلاً بعد نسل تمام پیغمبروں
میں ہوتا ہوا بالآخر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صورت میں ظاہر ہوا اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق
ان سے علی اور ائمہ اہل بیت میں منتقل ہوا۔ مگر صوفیا کا عقیدہ ہے کہ یہ نور جملہ اولیا میں ساوی ہے
ابن العربی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دراصل حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ یہ وہ فقرہ ہے جسے اوریجن
Origen نے اصول یا کلمہ تخلیق کائنات (امر کن) کے بیان کرنے اور ارسطو کے "عقل فعال" کی
جانب اشارہ کرنے میں استعمال کیا ہے۔ اس حیثیت سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تخلیق کائنات
کے لیے واسطہ بنے اور اس دنیا میں خدا کے خلیفہ بنے اور قطب بنے جن پر اس دنیا کا قیام منحصر ہے
اور جن کے لیے یہ دنیا بنائی گئی اور تنہا وسیلہ بنے جملہ الہامات ربانی کا کیونکہ آپ پیغمبر تھے جب کہ
آدم مٹی تھے۔ یہ سینٹ پال اور مصنف انجیل چہارم کے اقوال متعلق بہ مسیح کی کچھ آواز بازگشت سی
معلوم ہوتی ہے ممکن کہ کسی حد تک ایسا ہو بھی۔ بہر نوع ابن العربی عیسائیت کے ساتھ ایک خاص قسم کی

۱؎ ظنیات اور پرواز تخیل سے یہاں پروفیسر صاحب کام لے رہے ہیں یا حضرت ابن عربی رح؟ صرف مماثلت (قیصی یا ذوقی؟) مماثلت جزدی سے ماخذ کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ محض مماثلت کلی سے بھی اس امر میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمدردی[1] اظہار کرتے ہیں۔ اور لفظ "کلمہ" کا استعمال مسیح و محمد (علیہما السلام) دونوں کے لیے کرتے ہیں گو صرف ان دو ہی میں اسے مقید نہیں کرتے ہیں۔ خالص توحیدی تصوف تقریباً لازمی طور پر یا فلسفہ ہمہ اوست (Pantheism) کی جانب رہنمائی کرتا ہے یا اولیا پرستی کی جانب (جیسا کہ اسلام میں پیش آیا) دونوں کی جانب خالص فطرت الٰہی سے قطع نظر کرکے توجہ شخصی کے لیے حد نظر صرف پیغمبر یا ولی ہی تک پہنچکر رہ جاتی ہے جن میں سے اور جن کی وساطت سے خدا اپنے کو ظاہر کرتا ہے تخلیق کائنات کے متعلق اس اسلامی اصول کلی کے وجود میں آنے کا سبب اس مذہبی جوش کی تسکین کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جو توحید الٰہی میں فرق آنے دینا گوارا نہیں کرتی مسیحیت نے تشخیص الٰہی میں جو تفریق کی ہے اس کو چھوڑ کر یہاں تفریق حیثیات سے کام لیا گیا ہے۔ انسان کامل دنیا میں خدا کا مظہر ہے۔ لہذا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صوفیانہ عبادت[2] اکثر ان الفاظ میں اکرتی ہے جنہیں رسول کی خدا کی شان میں گستاخی قرار دیتے مثلاً "نور محمدی کا ظہور نہ ہوتا تو زمین پر کسی اسرار کا اظہار نہ ہوتا، نہ کوئی چشمہ جاری ہوتا نہ کوئی دریا بہتا"۔ صوفی انہیں "اللہ کا محبوب" کہتے ہیں اور وہ اللہ کے عطیات کو ان لوگوں پر تقسیم کرتے ہیں جو ان سے محبت اور رابطۂ روحانی رکھیں۔

ابن عربی کے نزدیک پیغمبر اولیا کا احترام اُن بکثرت عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے جن کے ذریعہ خدا اپنا اظہار فرماتا ہے بقول ان کے سچے صوفی کے لیے خدا ہر مذہب میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"میرے دل میں ہر صورت سما سکتی ہے میرے دل میں دیر کے لیے بھی گنجائش ہے اور بتوں کے لیے بھی۔ وہ آہوؤں کی چراگاہ ہے۔ اور پاکباز دل کا کعبہ۔ توریت کی تختیاں بھی اس میں ہیں، اور قرآن بھی عشق

[1] جب لفظ "کلمہ" کے استعمال کو وہ صرف ان دو ہی میں مقید نہیں کرتے تو تخصیص ہی کیا ہوئی پروفیسر صاحب کو اس تصنیع تان کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق سمجھتا ہے اور اصلی اور سچے مذہب عیسوی کے ساتھ نہ کہ بگڑی ہوئی محبت کیساتھ ہمدردی رکھتا ہے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ابن عربی رح کو اگر سچی عیسویت کے ساتھ ہمدردی تھی تو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ (ذوقی)

[2] کوئی مسلمان خواہ وہ صوفی ہو یا غیر صوفی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت نہیں کرتا۔ ہاں آپکا احترام اور آپ سے محبت ہر مسلمان کا فرض ہے عبادت اور احترام میں فرق ہے ہر عبادت محبت و احترام ہے۔ مگر ہر محبت و احترام عبادت نہیں اولاد باپ سے محبت بھائی کا بھائی کا احترام ہی محبت احترام عبادت نہیں پروفیسر نکلسن یہاں بھی مسلمانوں کو کس نگاہ سے دیکھا ہے۔ (ذوقی)

میرا مذہب ہے اس کے اونٹ جہاں چاہیں چریں۔ مگر میں تو اپنے سچے عقیدہ ہی پر قائم ہوں"۔
مذہب والوں کا خدا صوفیوں کے خدا کے مقابلہ میں محدود ہے۔ بدیں وجہ اپنے ہی مسلک کے لوگوں
کی تعریف اور غیر مسلک والوں کی مذمت جہالت اور ناانصافی ہے۔ لامذہب اور بت پرست بھی خدا کے
بندے ہیں اور خدا کی صورت پر پیدا کئے گئے ہیں اور اس کے بندے ہمدردی کے زیادہ مستحق ہیں گو شریعت
ان کے لیے سزائے موت ہی کیوں نہ تجویز کرے بلحاظ اس کے کہ روح ہستیِ حق کا ایک پہلو ہے۔ ابن العربی یہ نتیجہ
نکالتے ہیں کہ افعالِ انسانی خود مختارانہ ہیں مگر ان کے مسلک میں اس اختیار کے عام فہم معنی نہیں۔ خدا خود
افعال کا صدور مقتضائے فطرت الٰہی فرماتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی لامحدود صفات سے
لامحدود آثار مترتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نور و ظلمت، نیکی اور بدی، اور دیگر اضداد کا ظہور بھی
یقینی ہے اور ان اضداد کے بغیر علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ چونکہ شر محض کا وجود ہی نہیں دوزخ ایک
عارضی چیز ہے جس سے دوزخی بالآخر نجات پا جائیں گے۔ (باقی)

انسانیت کی تقسیم کے مختلف پہلو

(۲)

از جناب مولانا مناظر احسن گیلانی

سیاسی تقسیم جو اندر تھا جس کی ساری بلندیاں، برتریاں صرف باطنی صفات کے ساتھ وابستہ تھیں، تقسیم کے وقت خواہ مخواہ لوگوں نے اس بیچارے کو اندر سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ایک اور صرف ایک ہی ذہنی غلطی تھی، مگر تم نے دیکھا کہ محض اس کی بدولت اغلاط کے کتنے ہمالیہ تھے جن کے نیچے آدم کی نسل زمین کے ہر حصہ میں دفعۃً دب گئی، اور کچھ اس طرح دبی کہ اب ان چٹانوں کا سرکانا شاید بشر کی کمزور قوت سے تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ بیرونی تقسیم کے مباحث کو صرف اسی نقطہ پر ختم کر دوں لیکن ابھی ایک مغالطہ اور باقی ہے۔ ان ہی بیرونیوں میں ایک جماعت اور ہے جو انسانی نسل کو بجائے رنگ، زبان، خون، اور وطن کے ایک اور طریقہ سے تقسیم کرتی ہے، جس کا نام انہوں نے سیاسی تقسیم قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مختلف سلطنتوں اور بادشاہتوں کی رعایا کو باہم ایک دوسرے سے وہ جدا کرتے ہیں اور اس طرح جدا کرتے ہیں کہ باوجود ایک ہی نوع کے افراد ہونے کے یہ ان آبادکاروں کو جو کسی ایک سلطنت کی قلمرو میں رہتے ہیں، ان کے ان بھائیوں سے توڑنا چاہتے ہیں جو کسی دوسری حکومت کے حلقۂ اثر و اقتدار میں زندگی بسر کرتے ہیں، گویا اس تقسیم کی بنیاد سلطنتوں کی تقسیم پر مبنی کی گئی ہے، کہا جاتا ہے اور شاید یہ کہنا چنداں غلط بھی نہ ہو کہ انسانیت کی تمام خارجی تقسیمیں دراصل اسی تقسیم کے استحکام کے لیے تراشی گئی ہیں۔ لیکن کیا واقعہ میں یہ انسانیت کی تقسیم ہے؟ کیا فرق پیدا ہوتا ہے ان لوگوں میں جو مثلاً الف کی حکومت میں آباد ہیں اور ان میں جو ب کے حیطہ اقتدار میں بودوباش کرتے ہیں؟

کیا انسانوں کی ان دو جماعتوں میں کوئی واقعی امتیاز پیدا ہوا ہے، یا ہو سکتا ہے؟ یقیناً دو مختلف سلطنتوں کے رہنے والوں میں نہ کسی چیز کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور نہ کسی چیز کی کمی ہوتی ہے، پھر ایک کو چند قرار دینے پر انھیں کیوں اصرار ہے، جو اس وحدت میں واقعی تعدد پیدا کرنے سے قاصر ہیں؟۔

پس سچ یہ ہے کہ سیاسی تقسیم دراصل انسانیت کی تقسیم ہی نہیں ہے، بلکہ انسانی مملوکات کی تقسیم ہے اور بلاشبہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے مملوکات کو ان لوگوں سے بچائے جو اس کے جائز مالک نہیں ہیں اگر زید اپنے زر، اپنی زمین کی حفاظت میں اس حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس راہ میں وہ اپنی جان سے بھی دریغ نہیں کرتا تو یقیناً یہ اس کا منصبی فریقہ ہے،۔

"مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْد"

"اپنے مال کے بچانے میں جو مارا گیا وہ شہید ہے (فتویٰ نبوی صحیح مسلم)

یہ ان کا فیصلہ ہے جو اس راہ میں قتل ہونے والوں کو اس وقت بھی دیکھتے ہیں جب تک وہ قتل نہیں ہوئے، اور اس وقت بھی جب قتل ہو کر وہ بجائے غائب ہونے کے شہیدا و نعمتوں کی دوسری دنیا میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پس اگر اشخاص کے لیے واجب ہے کہ اپنے مملوکات کو دوسروں کی دست برد سے بچائیں، پھر کیوں متعجب کیا جائے، اگر اقوام بھی اپنی اپنی ملکیتوں، یا اپنے بادشاہ کے مملوکات ان لوگوں سے بچانا چاہتے ہیں جو اس کے مالک نہیں ہیں؟ قدرت کا فطری قانون یہی ہے، اور شرعی مسئلہ بھی یہی ہے لیکن اس سچ کے لیے جھوٹ کی پناہ ڈھونڈھنے کی کیا حاجت ہے؟ مملوکات و مقبوضات کو جدا کرنے کی خاطر خود انسانیت کی چیر پھاڑ کے لئے وہ اپنی چھری کیوں تیز کرتے ہیں؟

الحاصل اگر سیاسی "تقسیم" انسانی مملوکات کی تقسیم ہے تو یہ ایک واقعہ ہے اور شخصی و قومی ہر قسم کے مملوکات کے لیے تقسیم کا یہ دائرہ وسیع ہے صحیح ہے لیکن اگر اس کے ذریعہ سے خود انسانوں کی تجزی و تفریق مقصود ہے

تو یہ تقسیم بھی انہی تقسیموں میں سے ایک قرار پائے گی جس کی بنیاد کسی واقعہ پر نہیں بلکہ صرف فرضِ وہم اختراع، کی ہوائی نیو پر قائم ہے۔

کیا جھنڈوں کی لکڑیوں پر جو دھجیاں لپیٹی جاتی ہیں یا بانس کے لٹھوں سے جو چیتھڑے باندھے جاتے ہیں ان کے نت نئے رنگوں۔ اور بوقلمون دھاریوں کو تم ان لوگوں میں دکھا سکتے ہو جن کی طرف منسوب کر کے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ جن کا رنگ یہ نہیں ہے وہ ہم میں سے نہیں ہیں؟ ان میں سے کون پیلا اور نیلا ہوتا ہے؟ کس کے بدن پر آڑی ترچھی لکیریں ہوتی ہیں؟ سونے اور روپے یا ان جیسی معدنی دھاتوں پر جو نقشے کاڑھے جاتے ہیں، یا ٹھپے ابھارے جاتے ہیں کیا ان کو ان لوگوں کی پیشانیوں اور بازوؤں پر بھی ٹٹولا جا سکتا ہے، جن کو باور کرایا گیا کہ ان سے جدا ہو جاؤ، جن میں ان بل بوتوں صورتوں اور مورتوں والے سکوں کا چلن نہیں ہے؟

سیدھی باتوں کو ٹیڑھی راہوں سے کیوں تلاش کیا جاتا ہے؟ مملوکات و مقبوضات کی جدائی سے ذات کی جدائی کا نظریہ آخر کس لیے پیدا کیا گیا، یقیناً اگر زمینوں کو، مالوں کو روپیوں اور پیسوں کو نہ بانٹا جائے گا تو ان سے باطمینان قلب آزادی کے ساتھ نفع اٹھانے کی راہ بنی آدم پر بند ہو جائے گی۔ مانو! جو چیزیں بٹی ہوئی ہیں یا کاٹو جو چیزیں کٹی ہوئی ہیں لیکن جڑے ہوؤں کو اسی غرض اور صرف اسی غرض کے لیے کیوں توڑتے ہو؟ اس کیلئے اوہام میں واقعات کا رنگ کیوں بھرتے ہو؟ جو گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آتا ہے، اس کے لیے اپنی پوروں کو کیوں ٹیڑھا کرتے ہو؟ جائز چیزوں کو ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر تمھیں کیوں اصرار ہے؟

الحاصل انسانیت کی وہ ساری تقسیمیں جن کی بنیاد بجائے اندر کے باہر پر اور بجائے باطن کے ظاہر پر رکھی جاتی ہے در اصل یہ فطرت کے اٹل قانون سے سرکشی ہے،

انسانیت کی صحیح تقسیم | قدر و قیمت، رفعت و منزلت، افضلیت و اہمیت جیسا کہ بار بار کہا گیا جب

ہر اعتبار سے آدمی کے اندر ہی کو دیکھا جاتا ہے، اور اس کے باطن ہی کو تا یا جاتا ہے تو قسمت کے قرب کن بدقسمتوں نے کہا کہ انسان کو باہر لایا جائے جنہوں نے یہ کیا، یا کر رہے ہیں، یا آئندہ کریں گے ان کے نتائج ہمیشہ وہی ہوں گے۔ جو اب تک ہوئے ہیں اور ان کو یونہی ہونا چاہیے، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا لیکن دنیا کی وہ جماعت جو انسانوں کی ضروریات اور حاجات سے نہیں ان کی سواری اور روشنی سے نہیں، ان کے کپڑوں اور جوتوں سے نہیں، بلکہ خود انسانوں سے بحث کرتی ہے؛ اور جس کی بحث کا موضوع وہ چیزیں نہیں ہیں، جو انسان کے لیے ہیں، بلکہ جنہوں نے اپنی نظر و فکر کا مرکز خود انسان کو بنا کر یہ سوال اٹھایا کہ خود انسان کس لیے ہے؟ ہم جنھیں اپنی اصطلاح میں ادیان و ملل کے منادی کہتے ہیں اور جن کا آسمانی خطاب انبیاء و رسل ہے (صلوات اللہ علیہم اجمعین) تقسیم کے وقت ان کی نگاہیں بجائے ظاہر کے ہمیشہ انسان کے باطن ہی پر پڑیں، اور یہی وہ میدان ہے جہاں انسان بانٹا جاتا ہے اپنے اندرونی احساسات و ادراکات کی بنیاد پر بانٹا جاتا ہے اپنی دماغی کیفیات ذہنی تغیرات کی بنیاد پر بانٹا جاتا ہے اپنے خیالات و عقائد کی بنیاد پر کہ انسان کی ساری دولت اندر ہے، ورنہ جیسا کہ میں چیختا چلا آ رہا ہوں کہ اس کے باہر میں تو شاید اتنا بھی نہیں ہے، جتنا بیابان کے چرندوں، اور جنگل کے درندوں، درختوں کے پرندوں، دریاؤں کے باشندوں کے پاس ہے۔

اور یقیناً یہی وہ تقسیم ہے کہ بآسانی اس تفریق کو جمع سے، اس افتراق کو اتفاق سے اس کثرت کو وحدت سے بدلا جا سکتا ہے، کہ خیالات بدلے جا سکتے ہیں، اور ہمیشہ بدلتے رہے ہیں احساسات و عقائد میں تغیر ہو سکتا ہے، اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

پس جو ان بنیادوں پر تو ڑے گئے ہیں یا ٹوٹ گئے ہیں، تھوڑی کوشش سے وہ جوڑے جا سکتے ہیں، یا جڑ سکتے ہیں وہ آنکھوں میں خاک جھونکتے ہیں عقل پر پتھر مارتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ

کسی کالے کو گورا بنانا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ کسی ہندو کو عیسائی بنانا۔ کالی کھال کو کس نے اجلا کیا؟ اور کر سکتا ہے؟ لیکن ہندوؤں کو عیسائی یا عیسائیوں کو مسلمان ہوتے ہوئے کس نے نہیں دیکھا، اور کون نہیں دیکھ رہا ہے؟ تورانی نسل کے آدمی کو آریوں کے خون میں کون شریک کر سکتا ہے؟ لیکن رومن کیتھولک کی کتنی آبادیاں تھیں جہاں اب صرف پروٹسٹنٹ آباد ہیں۔ بہر حال قوموں کو ایک مذہب سے علیحدہ ہو کر دوسرے مذہب کی تعلیمات قبول کرتے ہوئے کب نہیں دیکھا گیا اور کہاں نہیں دیکھا جا رہا ہے؟ لیکن چینی بولنے والی قوموں کو بنگالی زبان کے بدلنے پر آمادہ ہوتے ہوئے کبھی سنا گیا؟ یا کہیں مشاہدہ کیا گیا؟ افراد کی زبانیں بدلتی ہیں، اور بدلی جا سکتی ہیں لیکن قوموں کی زبانوں کا بدلنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنا۔ پانی کی طرح تقریباً نصف صدی سے دیکھو کہ آدمی کی کمائی ہوئی دولت صرف اس غرض سے ہندوستان میں بے دردی کے ساتھ بہائی جا رہی ہے کہ جن ہندوستانیوں کی زبان ہندوستانی (اردو) ہے وہ انگلستانی بولی بولنے لگیں کوئی دقیقہ ہے جو اس کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ عمارتوں کا دھوکہ دیا جاتا ہے، فرنیچروں کا مغالطہ پھیلایا جا رہا ہے، ہر ہر صوبہ میں کتب خانوں کو فلک نما ایوانوں اور مدرسوں کو سپہر سا دیوانوں کی شکل تک ترقی دی گئی ہے، اور دی جا رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ قانون بھی ملک کے طول و عرض میں نافذ کیا گیا ہے کہ رزق کے وہ سارے دروازے جنہیں حکومت نے کھولا ہے ان پر قطعاً بند کر دیے گئے جو انگریزی نہیں جانتے، عزت کی کرسیوں سے ہندوستان میں وہ محروم کیے جاتے ہیں۔ جو جزائر برطانیہ کی زبان سے جاہل ہیں، اخباروں رسالوں کانفرسوں اور لیڈروں کے خطیبوں اور مقرروں سب کے اندر سے یہی آواز پیدا کی جا رہی ہے کہ زندگی صرف ان کے لیے ہے جو انگریزی جانتے ہیں، موت کا انتظار وہ کریں جو اس زبان سے اب تک بیگانہ ہیں، اور یہ عجیب و دلچسپ تماشہ ہے جدھر نظر اٹھاؤ صرف انگریزی کے حروف، انگریزی کے الفاظ، انگریزی کے

الغرض آسمان بھی انگریزی بنایا گیا ہے، اور زمین بھی انگریزی ہی میں غرق ہے لیکن کاوش کی ان سرگرمیوں، اور کوشش کی ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد نتیجہ کیا ہے؟ ملک کے دس فی صدی باشندے بھی صرف انگریزی سیکھی ہے، اور اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر اس کو اپنی زبان نہیں بنایا ہے۔

روس کے آبادکاروں نے صرف چند سالوں میں سرمایہ داری کے نظام کا انکار کرکے بولشویکی نظام کو قبول کرلیا، کیا اسی سہولت کے ساتھ زشین قبائل سے انگریزی زبان بلوائی جاسکتی ہے؟ پھر جو سائبریا میں رہتے ہیں۔ ان کو تم ہندوستانی کس طرح بنا لوگے؟ کس کا بوتا ہے، کہ گنگا، جمنا، گوداوری اور کرشنا کی وادیوں میں، ان برفستانی زمینوں کو مدغم کردے جسے جغرافیہ والے سائبریا کا خطہ کہتے ہیں؟ وہ جو تقسیم کی ایک بھدی اور غلط شکل سیاسی تھی بالفرض اگر یہ تقسیم انسانیت ہی کی تقسیم ہو، تو کیا دنیا کے سلاطین اور حکومتوں کو کوئی وحدت کے اس نقطہ پر لاسکتا ہے کہ ان میں ہر ایک اپنے اپنے مملوکات سے دست کش ہو کر چند حکومتوں کو صرف ایک حکومت کی شکل میں بدل دے؟ اگر یہ ممکن تھا یا ہے، تو ہوائی جہازوں کی یہ قطاریں کس لیے منڈلا رہی ہیں، زہر بھرے ہوئے گیسوں کا ذخیرہ کیوں اکٹھا کیا جا رہا ہے، توپوں اور بندوقوں کے لیے پہاڑ کس لیے گلائے جا رہے ہیں، خون کی ان ندیوں اور نالوں، بلکہ دریاؤں اور سمندروں کی کھدائی کس لیے ہو رہی ہے جن میں صرف انسان کی لاشیں پیرائی جائیں گی؟

تتبعھا الرادفہ

حقوقُ الزوجین

(۲)

اصول قانون قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی قانون ازدواج کی تدوین کن اصول پر کی گئی ہے، اس لیے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں، جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصل اول اصول قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ اس درجہ کی تشریح ہم کو اس آیت میں ملتی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (۴ - ۶)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں بتوفیق الٰہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو قوام کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں کلام کی بحث ہے، لہٰذا اپنے موضوع کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے بہرحال زوجین میں سے ایک کا قوام اور صاحب امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی

اختیارات رکھنے والے ہوں تو بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے، جیسی کہ فی الواقع ان قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اس لیے اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو قوام اور صاحبِ امر اور دوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا، اور قوامیت کے لیے اس فریق کا انتخاب کیا جو فطرۃً یہی درجہ لے کر پیدا ہوا ہے۔

مرد کے فرائض: پس اسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے، اس میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱- مہر: وہ عورت کا مہر ادا کرے، کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ اسی مہر کا معاوضہ ہیں۔ اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مرد ہی قوامیت کا مستحق ہے، مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اُس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے۔ اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے، مثلاً۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (۴:۱)	اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو۔
وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ..... فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (۴:۴)۔	محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں کہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو نکاح میں لاؤ ..... پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے بدلے میں قرار داد کے مطابق تم ان کے مہر ادا کرو۔
فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (۴:۴)۔	پس لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت پر نکاح کرو اور اقتصاد و احسان کے ساتھ ان کے مہر ادا کرو۔
وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ	اور حلال کی گئیں تمہارے لیے عزت دار عورتیں مومنوں

مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ (۵:۱)۔

میں سے اور عزت دار عورتیں ان لوگوں میں سے جن کے پاس تم سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے جب کہ تم ان کے مہر ادا کرو۔

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان مہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اس کو پورا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اور اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت مرد کے لیے بجز اس کے نہیں ہے[۱] کہ عورت یا تو اس کو مہلت دے یا اس کی ناداری کا لحاظ کرکے بخوشی معاف کر دے، یا اس پر احسان کرکے برضا و رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا۔ (۴:۱)

پھر اگر وہ خوش دلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ پیو۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (۴:۴)۔

اور اگر تم قرارداد کے بعد اس میں کمی زیادتی باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

۲۔ نفقہ | شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے۔ قانون اسلام نے زوجین کے حدود عمل کی واضح طور پر تقسیم کر دی ہے۔ عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دینا ہے۔ (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ)۔ اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر شوہر کو اپنی بیوی پر فضیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے۔ اور یہ چیز قوامیت کے عین مفہوم میں داخل ہے۔ قوام کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو کسی شے کی نگہبانی اور خبرگیری کرنے والا ہو اور اسی حیثیت سے اس شے پر اقتدار

[۱] اسی کو مہر مؤجل کہتے ہیں مگر آج کل مہر مؤجل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ وقت پر ہزاروں لاکھوں کی دستاویز یہ سمجھ کر لکھ دی جاتی ہے کہ "کون لیتا ہے کون دیتا ہے"۔ گویا ابتدا ہی سے ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی، حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جائے وہ قطعاً فاسد ہے۔

رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ الخ میں وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر شوہر اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا مالدار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

۳۔ ظلم سے اجتناب | مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو ترجیحی حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً:۔

ایلاء | عورت کے واعیاتِ نفس کو پورا کرنے سے کسی عذرِ جائز[1] کے بغیر اعراض کرنا، جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لیے قانون اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلق زن و شو قائم کرلے۔ ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ	جو لوگ اپنی عورتوں سے ایلاء کرتے ہیں۔ ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کریں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کریں تو اللہ سننے

[1] عذر جائز سے مراد مرد یا عورت کی بیماری یا مرد کا حالت سفر میں ہونا، یا کوئی اور ایسی صورت پیش آجانا، جس میں مرد اپنی بیوی کی طرف رغبت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے پر قادر نہ ہو۔

سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (۲۲۶:۲)۔　　　اور جاننے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلاء ہوگا۔ اور یہ حکم جاری کیا جائے گا، لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے۔ اس پر ایلاء کا اطلاق نہ ہوگا لیکن یہ بات قانون اسلامی کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا کسی شخص کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جا سکتی۔ اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کے لیے ہونی چاہیے جس کو وہ برداشت کر سکتی ہے۔ اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالایطاق ہے، اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس سے مرد و عورت کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے پس آیت مذکور الصدر کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترک مجامعت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کے لیے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا، تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور قسم کھا لینے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا صحابہ کرام میں سے جو لوگ تعمق فی الدین کا شرف رکھتے تھے۔ (مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ، اور حضرت عبد اللہ ابن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر) ان کی رائے اس باب میں یہی تھی کہ ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا ایلاء ہے، خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو (احکام القرآن للجصاص الحنفی ج ۱ ص ۴۲۰)

فان عزموا الطلاق کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حضرات عثمان ابن عفان، زید بن ثابت، ابن مسعود، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت کا گذر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہذا اس مدت کے ختم ہو لینے پر اس کو رجوع کا حق باقی

نہیں رہتا حضرات علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے مگر ایک دوسرا قول جو موخر الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے، یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ یا اپنی بیوی سے رجوع کر دیا اس کو طلاق دے دو۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مُولی کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہے، اور اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز عزیمت طلاق کے اور کوئی نہیں ہے اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے، جو کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے۔

ضرار اور تعدی عورت سے رغبت نہ ہو، اس کو رکھنا نہ چاہے اگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے اس کو رکھ چھوڑے بار بار طلاق دے اور دو طلاقوں کے بعد تیسرے طلاق سے پہلے رجوع کرے، قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ (۳/۲)

اور ان کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے نہ روک رکھو جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کو ٹھٹھا نہ بنا لو۔

ضرار اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے گا، روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا، ادنی طبقہ کا ہوگا تو مار پیٹ اور گالم گلوچ کرے گا۔ اونچے طبقے کا ہوگا تو تذلیل اور ایذا رسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرار اور تعدی کے الفاظ ان سب پر حاوی ہیں، اور قرآن مجید کی رو سے یہ سب افعال ممنوع ہیں۔ جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائز

حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

ازواج میں عدل نہ کرنا متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں عدل نہ کرنا، اور کسی ایک کی طرف مائل ہوکر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا۔ یہ بھی قرآن کی رو سے ممنوع ہے۔

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (۴ : ۱۹)۔ کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو۔

قرآن میں تعدد ازواج کی اجازت عدل کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر عدل نہ ہو تو اجازت آپ سے آپ منسوخ ہوجاتی ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ خود اس آیت میں جہاں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے، یہ صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴ : ۱)۔ پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا لونڈی جو تمہارے قبضہ میں ہو۔ یہ زیادہ قرین مصلحت ہے تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہوجاؤ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ نے اَلَّا تَعُوْلُوْا کے معنی یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑجائے لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔ لغت میں عول کے معنی میل کے ہیں۔ ابو طالب کا شعر ہے :۔

بمیزان صدق لا یغس شعیرۃ وو زان قسط وزنہ غیر عائل

یہاں عائل بمعنی مائل مستعمل ہوا ہے۔ اسی اصل سے عول کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی عکرمہ اور قتادہ

وغیرہم نے لا تعولوا کے معنی لا تمیلوا عن الحق کیے ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید کی مذکورۂ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا، اور ایک کی طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے، تعدّدِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ قانون ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہوگا۔

عدل کے باب میں قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دلی محبت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس میں مساوات برتنے پر نہ انسان قادر ہے، اور نہ اس کے لیے مکلف ہے (وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ) البتہ اس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ اور معاشرت اور تعلقات زن وشو میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔

مرد کے نشوز کی یہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلقات میں بہت سے ایسے معاملات بھی پیش آ سکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو مودت ورحمت کے منافی ہیں۔ مگر ان میں قانون کے لیے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے قرآن مجید نے ایسے معاملات کے لیے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ فیاضانہ اور محبت آمیز ہونا چاہیے۔ رات دن کی کھٹکا فضیحتی کے ساتھ زندگی گذارنا حماقت ہے۔ اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو، نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے۔ لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عدل وانصاف اور رحمت ومودت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

مرد کے حقوق | مرد کو قوامیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اوپر بیان ہو میں دیکھنا چاہیے

چاہیے کہ قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

حفظ للغیب | عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جا سکتا، وہ کہتا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ ..... حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔ (۴: ۶)۔	جو نیک عورتیں ہیں وہ غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ماتحت۔

یہاں حفظ للغیب سے مراد ہر اس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس رہے، اس میں اس کے نسب کی حفاظت اس کے نطفہ کی حفاظت اس کے مال کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آ جاتا ہے اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

شوہر کی اطاعت | مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (۴: ۶) جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں: — مثلاً۔

ان لکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احدًا تکرھونہٗ۔	تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔
لا تصدق بشیٔ من بیتہ الا باذنہ فان فعلت کان لہ الاجر وعلیھا الوزر ولا تخرج من بیتہ الا باذنہ۔	وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے اگر ایسا کرے گی تو اجر شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہوگا نیز وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لا تصوم المرأة یوما و زوجھا شاھد من غیر رمضان الا باذنہ۔

عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان کے سوا کوئی نفل روزہ اس کی اجازت کے بغیر ایک دن بھی نہ رکھے۔

خیر النساء امراۃ اذا نظرت الیھا سرتک واذا امرتھا اطاعتک واذا غبت عنھا حفظتک فی مالک ونفسھا۔

بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تیرا دل خوش ہو جائے اور جب تو اس کو کوئی حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی حفاظت کرے۔

اس عام حکمِ اطاعت میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت سے اس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس حکم کو ماننے سے انکار کر سکتی ہے۔ مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے منع کرے، یا شراب پینے کا حکم دے، یا پردہ شرعی ترک کرائے، یا فواحش کا ارتکاب اس سے کرانا چاہے تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے، اس لیے کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ اس صورت خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے۔ اگر نہ کرے تو ناشزہ ہوگی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مرد کے اختیارات قانون اسلام نے چونکہ مرد کو قوام بنایا ہے، اور اس پر عورت کے مہر، نفقہ، اور نگہبانی و خبرگیری کی ذمہ داری عائد کی ہے، اس لیے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے، اور اپنے گھر کے اخلاق اور حسن معاشرت کی حفاظت کرنے، اور خود اپنے حقوق کو اتلاف سے بچانے کے لیے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانون اسلام میں ان اختیارات کو بوضوح بیان کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کر دی گئی ہیں جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

نصیحت، تادیب اور تعزیر اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسب ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے، اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ	اور جن عورتوں سے تم نشوز[1] دیکھو ان کو نصیحت کرو،
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	اور بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ
فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا	تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا کوئی
(۴: ۶)۔	طریقہ نہ ڈھونڈو۔

اس آیت میں واھجروھن فی المضاجع (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) سے سزا کے طور پر ترک مباشرت کی اجازت دی گئی ہے، مگر آیت ایلاء نے جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، اس کے لیے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے۔ ہجر فی المضاجع کی حد چار مہینے کی ہے۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے، اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکام الٰہی اس کو طلاق دیدے گا، اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ چار مہینے کی مدت اس کو ادب سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہوگا۔ کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ طلاق ہے) اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، یا وہ حسن معاشرت کے ساتھ کم از کم اپنے اس شوہر سے نباہ نہیں سکتی۔ نیز اس سے وہ مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لیے ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتہ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ

---

[1] نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے

ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لیے کسی ناجائز طریقہ کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں احدالزوجین اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں مودت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سفیان ثوری سے واھجروھن فی المضاجع کے معنی میں ایک دوسرا قول منقول ہے وہ کلام عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ہجر کے معنی باندھنے کے ہیں۔ ھجر البعیر اذا ربطہ صاحبہ بالھجاد۔ ہجار اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ ڈال دو۔

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے مگر اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرب غیر مبرح کی قید لگا دی ہے۔ یعنی ضرب شدید نہ ہونی چاہیے

اضربوھن اذا عصینکم فی المعروف ضربًا غیر مبرح۔	اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔
ولا یضرب الوجہ ولا یقبح۔	منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔

یہ دو سزائیں دینے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جا سکتی ہے جو "معروف" میں ہو۔ یعنی ایسے احکام میں جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہوں، نہ یہ کہ ہر جا و بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے۔ اور عورت نہ ماننے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔ جو کوئی

تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اس پر ترک کلام۔ اور جس پر ترک کلام کافی ہے اس پر ہجر فی المضاجع، اور جس پر ہجر فی المضاجع کافی ہے اس پر مارنا ظلم میں شمار ہوگا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صرف شدید اور ناقابل برداشت قصور پر دی جاسکتی ہے۔ اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد ناشز ہوگا، اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے استمداد کرے۔

طلاق دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کرسکتا ہو اس کو طلاق دیدے۔ چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لیے ان حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا تھا، کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہوتی تو مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا، اور صرف اس وقت اسے چھوڑے گا جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک ہو، اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے کو مل جائے تو اس دوسرے شخص سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس شخص کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس کا مال صرف ہوا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے، بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

اصل دوم اسلامی قانون ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے، اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے، مگر جب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ

اور رشتہ مناکحت میں ان کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و کراہیت اور طبائع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کے لیے علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے۔ اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں ملسکتی۔ ایک طرف وہ رشتۂ نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں ہے کہ زوجین کے لیے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے بہر حال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوسکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے۔ مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں، کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پائداری ہی باقی نہ رہے، اور رشتۂ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظم درہم برہم ہو جائے۔

اس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں:۔ طلاق، خلع، اور قضائے قاضی۔

طلاق اور اس کی شرائط اصطلاح شرع میں طلاق سے مراد وہ علیحدگی ہے جس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ مرد اپنے اس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے ان حقوق زوجیت سے دست بردار ہوسکتا ہے جن کو اس نے مہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا مگر شریعت اسلامی طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) اور تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات (شادیاں کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)۔ اس لیے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کرسکتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو تو جہاں تک ہوسکے اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔ وعاشروهن بالمعروف فان كرهتموهن ان کے ساتھ سلوک نیت کے ساتھ رہو اگر وہ تم کو ناپسند

فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا (۴ : ۳)۔ — بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو، مگر یک لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے ایک ایک مہینہ کے فاصلہ سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے مہینے کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا۔ ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے، یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش آیند تغیر ہو یا خود تمہارا ہی دل بدل جائے۔ البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیے تو پھر تیسرے مہینے کے ختم پر آخری طلاق دے دو جو تم کو عورت سے قطعی طور پر جدا کر دے گی۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲ : ۲۹)۔ — طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو نیکی کے ساتھ روک لیا جائے یا پھر احسان کے ساتھ چھوڑ دیا جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔۔۔۔ وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (۲ : ۲۸) — مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک انتظار میں رکھیں۔۔۔۔ اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت میں وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہوں گے

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین مہینوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے نہ بھیج دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو، ممکن ہے کہ ساتھ رہنے سہنے سے دل ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْۢ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ وَتِلْكَ — جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں سے نکال نہ دو اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی

حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (۶۵ : ۱)

بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد کوئی (اصلاح کی) صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ مدت مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں تو یا ان کو نیکی کے ساتھ روک لو یا نہیں تو نیکی کے ساتھ جدائی اختیار کرو (یعنی آخری طلاق دیدو جو بائن ہوگی)۔

پھر حالت حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طہر کی حالت میں دو، کیونکہ حیض کی حالت میں مرد اپنی بیوی سے رکا ہوا ہوتا ہے، اگر یہ رکاوٹ نہ رہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ جذبات لطیف شاید اس کو بیوی کی طرف راغب کر دیں اور طلاق کا ارادہ بدل جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دو کہ رجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمرؓ کو اس فعل پر توبیخ فرمائی، اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی:—

"اے ابن عمر تو نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرے پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دے۔ پھر جب وہ (تیسری) مرتبہ طاہر ہو تو اس وقت یا طلاق دے دے یا اس کو روک لے"۔

حضرت ابن عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اَرَأَيْتَ لَوْ كُنْتُ طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا كَانَ لِيْ اَنْ اُرَاجِعَهَا؟ اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا؟ حضور نے فرمایا

لما کانت تبین وتکون معصیۃ۔ نہیں وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے شرع اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے، اور اس سے اللہ کی حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام کا سورۂ طلاق میں سخت تاکیدی حکم دیا گیا ہے حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ جو شخص مجلس واحد میں تین طلاق دینے والا ان کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جدا کر دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا انہ قد عصیٰ ربہٗ وبانت امرأتہٗ۔ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی، اور اس کی عورت اس سے جدا ہوگئی حضرت علی فرماتے ہیں۔ لو ان الناس اصابوا حد الطلاق ما ندم احد علےٰ امرأۃ۔ اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے تو کسی شخص کو اپنی بیوی کے جدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت رکاوٹ یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاق بائن دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا، تا وقتیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے اور وہ دوسرا مرد اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برضا و رغبت اسے طلاق نہ دے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (۲ : ۲۹)۔ — پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ عورت ایک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔

نہ ایسی کوئی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچیگا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کرلیگا کہ اسے اس عورت سے

ساتھ نباہ کرنا نہیں ہے بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لیے حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت کو طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرا دے اور پھر کچھ دے دلا کر اس کو خلوت سے پہلے طلاق دلوا دے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح فرما دی ہے کہ تحلیل کے لیے نکاح تزویج کافی نہیں بلکہ عورت اس وقت تک پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے لطف صحبت نہ حاصل کرے لاتحل لزوجہا الاول حتٰی یذوق الآخر عسیلتہا وتذوق عسیلتہ۔ پھر جو شخص اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لیے حلال کرانے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرائے، اور جو اس غرض سے نکاح کرے، ان دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لعن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم المحل والمحلل لہ (ترمذی) (باقی)

مرآۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ۔

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے نیز انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ جب نشا ہو شعر جا ہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ کاغذ کتابت طباعت بہترین مجلد نہایت اعلیٰ قیمت عہ سکہ انگریزی للعہ سکہ عثمانیہ۔ دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے۔

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

مصنفہ :- استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تفسیر نظام القرآن

مترجمہ :- جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی -

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ　　(۱) ہم نے تجھے بخشا کوثر -

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ　　(۲) پس اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھ ، اور اسی کیلئے قربانی

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ　　(۳) تیرا دشمن خود ہی منقطع ہے -

سورۃ کا عمود اور ماقبل وما بعد ربط (۱) اگلی سورۃ (سورۃ الماعون) کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بیان میں ہے جنہوں نے خانۂ کعبہ کے اہتمام میں خیانت کی ، کیونکہ انہوں نے حج اور اس کے تمام مراسم بگاڑ دیے اور توحید اور غربا پروری مٹا کر نماز اور قربانی کی اصل حقیقت باطل کر دی ، جن کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور اس بات کے سزاوار ہوے کہ اللہ تعالی اپنے دستور کے مطابق ، اس نعمت کو ان سے چھین کر ان کے سپرد کرے جو اہل ہیں ، جیسا کہ فرمایا ہے -

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ - (سورہ محمد)　　اگر تم برگشتہ ہو جاؤ گے تو خدا تمہاری جگہ دوسری قوم چن لے گا ، پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے -

اس سے پہلے جو جماعتیں خیانت و بد عہدی کی مرتکب ہوئیں وہ ولایت بیت اللہ کے منصب سے محروم کر دی گئیں - اسی دستور کے مطابق اللہ تعالی نے اس سورۃ (کوثر) کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی کہ بیت اللہ مسکن ابراہیم خلیلؑ اور ان کی ذریت کی ولایت کے لیے

خدا نے تم کو اور تمہاری امت کو منتخب کیا۔ اس ذریت کے ذریعہ خدا تمام قوموں کو برکت دے گا، جیسا کہ توراۃ میں وعدہ کیا ہے۔ اور اسی لیے بیت اللہ کو "مُبٰرَکًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ" سرچشمۂ برکت اور لوگوں کے لیے ہدایت کہا۔

یہ عظیم الشان عطیہ الٰہی یقیناً سب سے بڑی کامیابی اور خیر کثیر ہے۔ یہی عطیہ اس حوض کوثر کا ضامن ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔ ان اعتبارات سے یہ سورۃ ماقبل کے بعد اسی طرح آئی ہے جس طرح عذاب کے بعد رحمت، سلب کے بعد بخشش، اور اہل دوزخ کے بعد اہل جنت کا تذکرہ آتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن مجید میں عام ہے۔

نیز چونکہ سورۂ نصر میں جو بیت اللہ سے ہجرت کا اعلان تھا، اس لیے نظم کلام مقتضی ہوا کہ پہلے بشارت اور تسلی کی سورۃ ہو تاکہ نظم قرآن ہی سے یہ واضح ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ نے رنج سے پہلے راحت کا فیصلہ کر لیا ہے، اگرچہ اس کا ظہور بعد میں ہو۔ اسی وجہ سے سورۃ کافرون جس میں اعلان ہجرت ہے، دو مبشر سورتوں یعنی سورۂ کوثر اور سورۃ نصر کے درمیان رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اس سورۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی بھی بشارت دی گئی تھی کہ آپ کی امت زیادہ ہوگی اور آپ کے اعداء بیت اللہ کی برکتوں سے محروم ہوں گے۔ اس لیے سورۃ کافرون میں اس محرومی کی اصل علت یعنی توحید کا بیان ہوا جو بیت اللہ کا حقیقی سنگ بنیاد ہے۔

یہ سورۃ کے عمود اور اس کے ربط پر ایک اجمالی نظر تھی۔ تشفی بخش تفصیلات بعد میں آئیں گی۔

لفظ کوثر کی تفسیر تاویل

(۲) اس سورۃ کی صحیح تاویل لفظ "کوثر" میں چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے اس لفظ کی تحقیق کی جائے۔ اس کے متعلق سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں، اس لیے ٹھیک معنی کی تعیین کے لیے کسی قدر تفصیل ناگزیر ہے۔

یہ معلوم ہے کہ "کوثر" "کثیر" کا مبالغہ ہے، کثر کے معنی دولت و ثروت کے ہیں۔ اس لیے کوثر کے

معنی ہوں گے ۔ ۱۔ بڑی کثرت اور برکت و ثروت والا۔ کثیر اور کبیر کی طرح کوثر بھی تسمیہ کے لیے مستعمل ہے بطور صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔ لبید کا شعر ہے ؎

وصاحب ملحوب فجعنا بموتہ — وعند الرداع بیت آخر کوثر

اور ملحوب کا سوار جس کی موت کے غم نے ہم کو محزون کیا — اور رداع کے پاس ایک اور داتا سردار کی قبر ہے

امیہ بن ابی عائذ الہذلی کہتا ہے ؎

یحامی الحقیق اذا ما احتدمن — وحمن فی کوثر کالجلال

وہ حرمت کی حفاظت کرتا ہے جب گرم ہو جائیں اور ہنہناتی ہیں بادبان کی طرح پھیلے ہوئے غبار میں

اس میں موصوف مقدر ہے یعنی "فی غبار کوثر"۔ اس سے فعل بھی مستعمل ہے۔ حسان بن نشبہ کا شعر

ابوا ان یبیحوا جارھم لعدوھم — وقد ثار نقع الموت حتی تکوثرا

انھوں نے اپنے پڑوسیوں کو دشمنوں کے لیے چھوڑ دینے سے انکار کر دیا اور حال یہ تھا کہ موت کے غبار نے ابھر کر تمام چھا لیا تھا۔

اس لیے از روئے لغت یہاں کوثر کی تین تاویلیں ممکن ہیں :-

۱۔ یہ اسمیت کی طرف منتقل ہو کر کسی خاص چیز کے لیے مخصوص ہو گیا ہو، جس کا نام اللہ تعالیٰ نے "کوثر" رکھا ہو۔

۲۔ اس کو ایسے موصوف مقدر کی صفت مانا جائے جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو۔ مثلاً کہتے ہیں "مررت بجرد" یعنی رجال مرد سے ہو کر گزرا یعنی نوخیز نوجوان اصیل گھوڑوں کے پاس۔ قرآن مجید میں ہے "والذاریات" یعنی الریاح الذاریات (غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم) "ذات الواح ودسر" یعنی فلک ذات الواح ودسر (تختوں اور کانٹوں والی کشتی) اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں لیکن ایسا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب صفت اس موصوف کے لیے مخصوص ہو کہ بجز ذکر صفت، موصوف ذہن میں آجائے

یا کوئی واضح قرینہ اس کی طرف اشارہ کردے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسمارِ صنف کی طرح اس کے عموم پر باقی رکھا جائے، جو قلیل و کثیر پر یکساں دلالت کرتے ہیں اور کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت جوامع الکلم کی ہوگی۔ وہ ہر اس چیز پر اس کی دلالت یکساں ہوگی جس میں خیرِ کثیر ہو البتہ قرآن کے اشارہ سے بعض افرادِ صنف پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہوگی۔

یہ تین احتمالات ہیں لیکن ہم اس کی تاویل میں، جیسا کہ ساتویں فصل کے بعد معلوم ہوگا جس اصل پیشِ نظر رکھیں گے وہ نظمِ سورت، سیاقِ آیات، ربطِ معنی اور حسنِ تاویل کی رعایت ہے رہا دوسرے وجوہ کا تذکرہ اور روایات کی تطبیق تو اس سے ہم محض اس لیے تعرض کریں گے کہ جو لوگ محاسنِ نظم اور حسنِ تاویل کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہیں ان کے شبہات کا ازالہ ہو سکے۔ اس تمہید کے بعد ہم کوثر کی تاویل میں سلف سے جو اقوال منقول ہیں، ان کو نقل کرتے ہیں۔

کوثر کی تاویل میں سلف کے اقوال ۳۔ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کئے ہیں۔

۱۔ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، انسؓ، مجاہدؒ اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

۲۔ کوثر سے مراد خیرِ کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

۳۔ کوثر جنت میں ایک حوض ہے، یہ عطاء رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

میرے نزدیک پہلے اور تیسرے قول میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کو موقف کا حوض اور جنت کی نہر بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو۔ پھر حضرت عکرمہ سے، جو کہتے ہیں

کہ کوثر سے خیر کثیر مراد ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ کوثر سے مراد نبوت ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کوثر قرآن ہے اسی طرح حکمت اور اسلام کی روایتیں بھی ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام روایات کو نقل کر کے یہ روایت اختیار کی ہے کہ جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔ انہوں نے حضرت انس رضؓ کی روایت پر اعتماد کر لیا، جو آنحضرت سے مروی ہے اور ان اقوال میں باہم تطبیق کی زحمت نہیں اٹھائی ہے، حالانکہ جو جماعت دوسری بات کہتی ہے، انہی میں سے بعض پہلی بات بھی کہتے ہیں۔ اور اسی طرح پہلی بات کے کہنے والوں میں سے بعض دوسرے قول میں بھی شریک ہیں پھر یہی لوگ ہیں جن سے قرآن، حکمت، اسلام اور نبوت کی روایتیں بھی ہیں۔ نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، اور آنحضرت صلعم نے اس کی کیفیت بیان کر دی تھی، پھر اس علم کے بعد، سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے اختلاف کیوں کیا؟ خصوصاً حبر الامۃ اور ترجمان القرآن اور ان کے شاگرد عکرمۃ! اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اقوال پر غور کیا جائے۔ تاکہ اصل حقیقت غیر مشتبہ صورت میں سامنے آجائے۔

ان اقوال کا ماخذ اور اس امر کا بیان کہ ان سب کا مرجع ایک جامع حقیقت ہے

(۴) جن لوگوں نے کوثر سے، جنت کی ایک نہر یا موقف کا حوض مراد لیا، انہوں نے اس کو اسم مانا ہے، جو صفت سے منقول ہو گیا ہے، اور اس روایت پر اعتماد کیا ہے جس میں آنحضرت صلعم نے اس حوض کے متعلق خبر دی ہے جو اللہ تعالیٰ آپ کو آخرت میں عطا فرمائے گا۔ اور جو لوگ اس سے "خیر کثیر" مراد لیتے ہیں وہ یا تو اس کا موصوف یعنی خیر محذوف مانتے ہیں کہ موقع ذکر نعمت کا ہے، یا خود صفت ہی کو خیر کثیر کے مفہوم میں لیتے ہیں اور دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے ان کا اعتماد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے۔

۱۔ اگر لفظ کوثر صفت سے اسمیت کی طرف منقول ہوتا تو اس کو نکرہ آنا چاہیے تھا مثلاً

سلسبیل، تسنیم، علیین، سجین، غسلین۔ اور قرآن چونکہ عربی مبین میں ہے اس لیے وہ اس کی شرح کرتا کیونکہ تسمیہ ایک وضع جدید ہے۔ اس لیے کوثر کو لام تعریف کے ساتھ استعمال کرنا، درانحالیکہ وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس سے لوگ واقف نہیں ہیں، قرآن کے عربی مبین ہونے کے منافی ہے۔ اس لیے بطریق نص وہ کسی خاص چیز کا نام نہیں ہو سکتا البتہ بطریق تاویل اس سے کوئی ایسی چیز مراد لے سکتے ہیں جس میں خیر کثیر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ آخرت کی بخششوں کو یا تو بصیغہ مستقبل ذکر کرتا ہے یا ایسے قرائن کے ساتھ بیان کرتا ہے جن سے مستقبل مفہوم ہو سکے۔ مثلاً

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ۔ (والضحیٰ) اور جلد تیرا خدا اپنی بخشش سے تجھے خوش کر دے گا۔

يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا۔ (بنی اسرائیل) کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں کھڑا کرے۔

۳۔ لفظ اپنے عموم پر باقی رہنے کی صورت میں زیادہ وسعت و جامعیت رکھتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ قرآن دریائے معانی ہے، پھر لفظ کوثر خود وسعت کا مقتضی ہے، تحدید و انحصار اس کے مزاج کے خلاف ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جو لوگ اس سے خیر کثیر مراد لیتے ہیں، وہ اس خبر کا انکار نہیں کرتے جو آخرت کے کوثر کے متعلق وارد ہے۔ وہ لفظ کو اس کی وسعت و عمومیت پر باقی رکھتے ہیں۔ جس کے دائرہ میں آخرت کی بخششوں سے یہ جنت کی نہر بھی داخل ہے، اور موجودہ نعمتوں میں سے قرآن، حکمت، نبوت اور اسلام بھی۔ وہ ان سب پر اس کا اطلاق بطریق تسمیہ و تعیین نہیں بلکہ بطریق تعمیم کرتے ہیں یعنی لفظ کو اس کے عموم پر باقی رکھ کر اس کے مختلف معانی میں سے اس فرد پر اس کا اطلاق کر دیا جو سب سے زیادہ جامع اور اکمل ہے۔

ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے تھے، اس لیے کوثر سے قرآن بھی مراد لیا

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے۔ اسی طرح حکمت بھی مراد لیا کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ جس کو حکمت بخشی گئی اس کو خیر کثیر بخشا گیا۔ اور یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں کیونکہ قرآن تمام جواہر حکمت کا خزانہ ہے۔ اسی اصول کے مطابق نبوت بھی اس کے دائرہ میں آگئی کہ فرمایا گیا ہے:۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر۔ اسی طرح اسلام بھی اس میں داخل ہے بلکہ اسلام کی وسعت و ہمہ گیری کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہے کہ تمام کائنات اس میں سما گئی ہے وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ　　آسمانوں اور زمین میں جو ہیں سب اس کے آگے سرنگندہ ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ یہ تمام اقوال قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اور اگرچہ الفاظ مختلف ہو گئے ہیں، لیکن حقیقت ایک ہی ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذیل میں اولاد کی کثرت، علماء اتباع کی زیادتی، فضائل اخلاق، حسن شہرت، خلق حسن، مقام محمود، خود اس سورۃ اور تمام انعامات خداوندی کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور اس کو ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں مذکورہ عمومیت میں داخل ہیں لیکن بعض لفظ کوثر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں، تاہم لفظ کا عموم ان سب پر حاوی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک استنباط کے لحاظ سے سلف کی تفسیر زیادہ صاف اور جچی تلی ہے۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس میں بہت سے مذہب نہیں ہیں، جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ صرف دو مذہب ہیں۔ ایک یہ کہ کوثر سے کوئی خاص چیز مراد لی جائے یعنی حوض موقف یا نہر جنت یا حکمت یا قرآن یا اسی قسم کی کوئی اور چیز۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ عام ہے، ہر چیز جس میں خیر کثیر ہو اس کے دائرہ میں داخل ہے۔ جو لوگ اس کو کسی معین چیز کا نام قرار دیتے ہیں،

اُن کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلعم نے نہر جنت کا ذکر کوثر کے نام سے فرمایا ہے۔ اور جو لوگ اس کو نہر اور نہر کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے عام مانتے ہیں، وہ حدیث اور قرآن میں تطبیق دینا چاہتے ہیں، انھوں نے قرآن کی تاویل، اس کی عبارت کے اقتضاء کے مطابق کی اور حدیث کی تاویل، اس طرح کردی کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں پڑتی۔ اس لیے یہ اختلاف نہ ہوا بلکہ دو تاویلوں میں جمع کی شکل ہوئی، کیونکہ عام اور خاص میں کوئی تباین نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس کے دو مختلف قولوں میں اسی قسم کی تطبیق حضرت سعید بن جبیر نے دی ہے چنانچہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت یہ کی ہے۔

حدثنا ابو كريب قال حدثنا عمر بن عبيد عن عطاء عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال الكوثر نهر في الجنة حافتاه من ذهب وفضة يجري على الياقوت والدر ماءه ابيض من الثلج واحلى من العسل۔

سعید بن جبیر .... ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔ اس کے کنارے سونے اور چاندی کے ہیں، اور وہ در و یاقوت پر بہتی ہے، اس کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

دوسری روایت یہ ہے اور اسی قسم کی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔

قال حدثني يعقوب قال حدثني هشيم قال اخبرنا ابو بشر وعطاء بن السائب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس انه قال الكوثر هو الخير الكثير الذي اعطاه الله اياه قال ابو بشر نقلت لسعيد بن

کہا مجھ سے حدیث بیان کی یعقوب نے، کہا مجھ سے حدیث بیان کی ہشیم نے، کہا ہم کو خبر دی ابو بشر اور عطاء ابن سائب نے ان دونوں نے روایت کی ابن عباس سے کہ انھوں نے کہا کہ مژدہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو بخشا۔ ابو بشر کہتے ہیں

جبیر فان ناسا یزعمون انه نھر فی الجنۃ   کہ میں نے سعید بن جبیر سے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال
قال فقال سعید النھر الذی فی الجنۃ   ہے کہ جنت کی ایک نہر ہے، تو سعید نے جواب دیا
من الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ   کہ یہ جنت کی نہر اسی خیر کثیر میں سے ہے، جو اللہ تعالے
نے آپ کو بخشا ہے۔

یہ دو قولوں کے درمیان تطبیق کی شکل ہے۔ یعنی خاص اور عام میں توفیق پیدا کر دی گئی ہے۔ پھر اگر قرآن اور حدیث کے درمیان کامل تطبیق کے لیے یہ کہا جائے کہ جو کوثر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو دنیا میں عطا فرمایا ہے، وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف کا حوض اور جنت کی نہر ہے تو یہ تطبیق زیادہ بہتر ہو گی، اور بہ اعتبار تاویل بھی، زیادہ مناسب اور خوبصورت ہے۔ ہم آیندہ فصلوں میں اسی اجمال کی شرح کریں گے۔

چند اشارات کہ کوثر خانہ کعبہ اور اس کا ماحول ہے	پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارہ میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کے عموم اور صیغۂ ماضی کی رعایت سے ان چیزوں کو بھی

اس کے دائرہ میں داخل کیا ہے جو داخل ہو سکتی ہیں۔ تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم با مسمیٰ (کوثر) ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں مزید جستجو اور کاوش جائز سمجھی۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے اس لیے اگر میں کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں جو دونوں کوثروں کو ایک کر دے، تو جس طرح میں سلف کو اس باب میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا، اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا۔ البتہ یہ فرق ہو گا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دیکر، اس سے حوض یا نہر جنت سمجھا، اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت، جن کو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں۔ مگر میں اس سے وہ چیز مراد لیتا ہوں جس کو اس حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے

جس کی کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں، اور جس کی حقیقت و روحانیت شب معراج میں آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ اس میمون رات میں، جب پروردگار عالم نے اس عالم آب وگل کی بہت سی چیزوں کے حقائق آپ کے لیے بے حجاب کیے تو اس کوثر کی روحانیت کا بھی آپ کو مشاہدہ کرایا جو اس دنیا میں آپ کو بخشا گیا۔

اس عالم کے جو اسرار آپ پر بے نقاب ہوتے تھے، آپ کبھی ان کا ذکر تصریحاً فرماتے تھے مثلاً سورہ بقرہ اور آل عمران کے متعلق فرمایا:- وہ دونوں بدلیوں کی شکل میں نمودار ہوں گی دنیا کی بابت فرمایا: "وہ بڑھیا کی شکل میں آئے گی"، موت کی نسبت فرمایا: "وہ ایک مینڈھے کی صورت میں آئے گی" اور کبھی صرف اشارہ فرما دیتے تھے کہ لوگ اس پر تدبر کریں، اور ان کے ذہن وعقل کی تربیت ہو۔ اس لیے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلعم نے تصریحاً یہ نہیں فرمایا کہ خانہ کعبہ قیامت کے دن حوض کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا، کیوں کہ آپ نے اس کی طرف اشارات فرمائے ہیں اور ہم کو ان پر غور وفکر کی ترغیب دی ہے۔

اس تمہید کے بعد، ہم ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جو ہمارے دعوی پر حجت ہیں۔

۱- یہ ایک حقیقت ہے کہ نفوس کے اندر، خدا کی طرف ایک فطری شوق ورغبت موجود ہے اور نفس انسانی اس سے محروم رہکر تسلی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا سرچشمہ ہے۔ اسی طرح اشتیاق و بیقراری کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کی کوئی قوم مذہب سے خالی نہیں پاتے۔

اب سوچو! اس فطری اشتیاق اور چاہ کی سب سے زیادہ موزوں تعبیر "پیاس" کے سوا کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تمثیل اکثر استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیش نظر رکھکر ان موحدین کے حال پر غور کرو جو حج کے ایام میں بیت اللہ کے پاس سرتاپا اشتیاق و آرزو

ہو کر جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال، ان خشک لب پیاسوں کی سی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہوگئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو خانہ کعبہ ان کے لیے دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے، جس پر میدان حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲۔ آنحضرت صلعم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا:-

ارأیتم لو ان نہرا بباب احدکم　بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر ایک نہر
یغتسل فیه کل یوم خمسا الخ . . .　جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو . . . .

یہ تمثیل ایک دوسرے پہلو سے پانی ہی کی ہے جس طرح پانی سیرابی کا ذریعہ ہے، اسی طرح طہارت کا ذریعہ ہے۔ اور معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے، اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اسی سرچشمہ کی نہریں ہیں، جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں اس امت کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح حوض کوثر پر اس کا اجتماع اس کی کثرت کے اظہار کا سبب ہوگا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ دوسری امتیں اس اجتماع سے اندازہ کرتی ہیں کہ زائرین بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحر بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے، جو پوری سطح ارض کو محیط ہے۔ پس جس طرح حوض کوثر پر اس امت کے اجتماع سے دوسرے انبیاء کی امتوں پر اس کی کثرت واضح ہوگی، اسی طرح موسم حج میں خانہ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہار کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو! لفظ کوثر ان دونوں کی مطابقت کو کس طرح واضح کر رہا ہے۔

۴۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی امت کو حوض کوثر پر وضو کے آثار سے پہچانیں گے

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوص قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے، وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۵۔ فتح مکہ کو خدا نے امت کی کثرت کا سبب بنایا چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ درگروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶۔ مسجد حرام کو خدا نے "مبارک" (سرچشمہ خیر و برکت) کہا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (آل عمران ۹۵)　　بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر ہوا، وہ ہے جو مکہ میں سرچشمہ خیر و برکت اور لوگوں کیلئے ہدایت ہے

اس گھر کو خدا نے ایسی برکت سے نوازا کہ تمام عالم اس کی برکتوں سے مالا مال ہوا، اور جیسا کہ ابراہیم خلیل ؑ سے وعدہ کیا گیا تھا حضرت اسمٰعیل کی ذریت میں خدا کی برکت حضرت اسحٰق کی ذریت سے زیادہ ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل سورۃ فیل میں گذر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام برکتیں اسی بیت اللہ اور نماز و قربانی کا ثمرہ ہیں۔

یہاں شبہہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے قرآن کو بھی مبارک کہا ہے، اس لیے حوض کوثر کے ساتھ اس کی مشابہت بھی واضح ہے لیکن یہ شبہہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن کو مبارک دوسرے پہلو سے کہا گیا ہے، جس طرح بارش کو خدا نے مبارک کہا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی مبارک کہا، کیونکہ بارش آسمان سے برس کر مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے، اور قرآن نے آسمان سے نازل ہو کر مردہ دلوں کو زندہ کر دیا۔ قرآن کو مبارک کہنے میں حوض سے مشابہت کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن کی عظمت اور بے پایاں وسعت کے اعتبار سے یہ تشبیہ بلاغت کے خلاف ہوگی۔

۷۔ یہ سورۃ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبہ اسلام اور کثرت امت کا فتح باب ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اس صلح کو "فتح مبین" سے تعبیر کیا۔ سورۃ کے زمانہ نزول پر

چودھویں فصل میں مفصل گفتگو ہوگی۔

۸۔ آنحضرت صلعم نے اس حوض کے ایک گوشہ کے متعلق خبر دیکر باقی کی طرف اشارہ کر دیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں مروی ہے :۔

قال علیہ السلام ما بین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ ومنبری علی حوضی۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض کے اوپر ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مبارک سرزمین جس میں حجاج یکجا ہوتے ہیں، اس حوض کوثر کی شکل اختیار کرے گی، جس کی آنحضرت صلعم نے خبر دی ہے، اور میرے نزدیک بخاری کی مندرجہ ذیل روایت (مذکورہ نمبر ۹) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نکلے، ایک شخص کے جنازہ کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لائے (یعنی منبر مسجد پر) اور فرمایا۔

انی فرط لکم وانا شہید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الآن وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض او مفاتیح الارض وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا۔

میں تمہارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں، اور میں تمہارے لیے شہادت دوں گا، اور قسم خدا کی میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، یا (راوی کو شبہ ہے) آپ نے یہ فرمایا کہ زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور مجھے، خدا کی قسم تم سے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن اس بات کا ڈر ہے کہ تمہاری بھاگ دوڑ طلب دنیا کی راہ میں ہو جائے۔

"فرط" عربی میں، اس شخص کو کہتے ہیں جو حوض پر پہلے سے پہونچ کر قافلہ کے لیے ڈول اور رسی وغیرہ کا

انتظام کرکے حوض کو بھر رکھتا ہے۔ "شہید علیکم" سے یہ مطلب ہے کہ آپ اپنی امت کو پہچانیں گے، اور لوگوں کے متعلق اپنی امت میں سے ہونے کی گواہی دیں گے۔ یہ آپ کی طرف سے شفاعت ہوگی۔

ان لفظوں میں، آپ نے ان حالات کو بیان فرمایا ہے جو آخرت میں پیش آئیں گے، پھر آپ نے اشارہ فرما دیا کہ اس حوض کوثر کی ظاہری مثال آپ کے سامنے ہے، کیونکہ، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، آپ کا منبر آپ کے حوض کے اوپر ہے۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا: - مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، تو اس سے فتح مکہ کے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا، چنانچہ فتح مکہ تمام زمین اور اس کے خزانوں کی فتح کا دیباچہ ثابت ہوا۔

۱۰- آنحضرت صلعم نے ظاہر فرما دیا ہے کہ آپ کے حوض کا طول، مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت جتنا ہے اس لطیف اشارہ سے ارض حرم اور آپ کے حوض کی مطابقت بھی واضح ہوگئی۔

لیکن اس جگہ ایک شخص کے دل میں خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مراد یہی تھی تو اس کو کھول کر کیوں نہیں فرما دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام کی تعبیر کے لیے قرآن مجید نے جو لفظ انتخاب کیا ہے، وہ بے شمار حقائق و معارف کا گنجینہ اور ہمارے لیے دعوت تفکر ہے۔ یہ ایک لفظ امت کی کثرت، مکہ کی فتح، ایام حج میں خانۂ کعبہ کے پاس، اور محشر میں حوض کوثر پر امت کے اژدھام، ان تمام حقائق کی طرف ایک ساتھ انگلی اٹھا کر اشارہ کرتا ہے۔

یہ تمام اشارات ہم نے اس مقصد کی تمہید و تائید کے لیے یکجا کیے ہیں جو نظم کلام سے واضح ہوتا ہے اور جس کی تفصیل انشاء اللہ اگلی فصلوں میں آئے گی اب تھوڑی دیر توقف کرکے حوض کوثر کی شکل و ہیئت پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمارے مذکورہ نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ کوثر آخرت درحقیقت خانۂ کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی تصویر ہے۔ بعد کی فصل میں اس اجمال کی تفصیل ہے۔ (باقی)

تفسیر سورۂ لہب

از جناب مولانا عبد القدیر صدیقی

تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ

تَبَّتْ، ہلاک ہوا، برباد ہوا، رائیگاں گیا۔ تباب مصدر۔

یدانِ دونوں ہاتھ۔ اضافت کی وجہ سے نون گر گیا یدا رہ گیا۔ ید کا لفظ عربی زبان میں ہاتھ، قوت، کوشش، کام کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

ابولہب۔ اصلی نام عبد العزیٰ تھا۔ چونکہ وہ بہت گورا اور سرخ رنگ تھا، اس لئے اس کی کنیت ابولہب یعنی پدر شعلہ رکھی گئی۔ عبد العزیٰ میں بت کی طرف نسبت تھی لہذا یہاں اس کا نام لیا گیا، اور ابولہب میں ملازمت آتش یعنی دوزخی ہونے کا ایہام بھی پیدا ہوتا تھا، اس لیے یہ کنیت اختیار کی گئی۔ "ابولہب کی ہر طرح کی کوشش ناکام رہی اور خود بھی برباد ہوا"۔

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔

اِغنیٰ عنہ۔ کام آیا۔ نفع دیا۔ ما اغنیٰ عنہ کچھ کام نہ آیا۔ کچھ بھی نافع نہ ہوا۔ مالُہٗ۔ نہ اس کا مال روپیہ پیسہ۔ وما کسب، اور نہ اس کی کمائی۔

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ۔

یَصْلیٰ۔ اس کے مادہ میں قرب کے معنی ساری ہیں۔ صلوین، سرین کی دو ملی ہوئی ہڈیاں مُصَلّی، مجلی یعنی اول آنے والے گھوڑے کے قریب کا گھوڑا۔ صَلوٰۃ دعائے رحمت۔ قرب الٰہی کا

موجب صلوٰۃ نماز، ارکان مخصوص جو در بار الٰہی میں تقرب کا ذریعہ ہے۔ سَیَصْلٰی الخ "عنقریب داخل ہوگا۔ یہ ابولہب آتش شعلہ زن میں"۔ ابو لہب اور ذات لہب میں کے لہب میں تجنیس ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ

اِمْرَأَۃ، عورت، جورو۔ ابولہب کی جورو کا نام ام جمیل ہے۔

حَمَّالَہ، بوجھ اٹھانے والی۔ اَلْحَطَب، جلانے کی لکڑی۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ، ہیزم کش چغل خور لگائی بجھائی کرنے والی شر انگیز باتیں لگانے والی جلتی آگ میں لکڑیاں ڈال کر اس کو بھڑکانے والی۔ فرمایا کہ ابولہب کے ساتھ اس کی شر انگیز جورو بھی شعلہ زن آگ میں داخل ہوگی۔

فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔

جِید۔ گردن، خوبصورت گردن حَبْل، رسی۔ مَسَد۔ کھجور کے نارے کی رسی جو مضبوط اور سخت ہوتی ہے۔ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔ اس کے گلے میں کھجور کے نارے کی رسی پڑیگی۔ وہ اپنی کوشش میں آپ پھنسے گی، اس کی شرارت اس کے گلے کی پھانسی بن جائے گی۔

ابولہب حضرت کا چچا تھا۔ اسلام کی مخالفت میں وہ اور اس کی جورو ام جمیل دونوں پیش پیش تھے روز نیا فتنہ برپا کرتے اور لوگوں کو بھڑکاتے۔ مگر ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ سب تدبیریں ناکام ہوئیں اسلام برابر ترقی کرتا گیا، اور ان کی فتنہ انگیزی انہی کے گلے میں پھانسی بن کر پڑی۔

ابولہب کے ایک بیٹے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی بیاہی گئی تھیں ان کو اس کے لڑکے نے طلاق دے دی۔ بہت ستایا۔ حضرت نے دعا کی اللّٰھم سلط علیہ کلبًا من کلابك۔ خدایا اپنے درندوں میں سے ایک درندہ اس پر مسلط کر دے، اس بددعا کے اثر سے بچنے کی انہوں نے لاکھ تدبیریں کیں۔ سفر کرتے تو پہلے سپاہیوں کا حلقہ ہوتا، پھر سامان کا حلقہ ہوتا بیچ میں اس لڑکے کو سلاتے مگر ایک مرتبہ شیر آیا اور بیچ میں سے اس کے لڑکے کو اٹھا لیا۔ نہ تدبیریں کام آئیں نہ دھن دولت۔ رسول خدا کا چھوڑا ہوا تیر کیسے خطا کرتا۔ ٹھیک لگا اور اثر نے پر لگا۔ ما اغنیٰ عنه ماله وما کسب

حاملانِ قرآن

حضرت شیخ عماد رضی اللہ عنہ

صفا و صدق عماد بقائے جاوید است
رہِ بقائے ابد جوئے و بے عماد مباش

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی علیگ

عہد جاہلیت کی تاریخ عربوں کے اس فخر کا رہ رہ کے تذکرہ کرتی اور بار بار اس کے مزے لیتی ہے

إذا مضرُ الحمراءِ كانت أرومتي — وقام بنصري خازمٌ وابن خازمِ

(جب میرا خاندان قبیلہ مُضر ہوا جن کے سرخ رنگ کے خیمے ہیں، اور خازم و فرزند خازم میری مدد کو اٹھے)۔

عطست بأنفٍ شامخٍ إذ تناولت — يداي الثريّا قاعدًا غير قائمِ

(تو فرطِ غرور سے میرا سر بلند ہوگیا، اس لیے کہ میرے دونوں ہاتھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے ثریا کو پالیا، کھڑے ہونے کی نوبت تک نہ آئی)

حضرت شیخ عماد رضی اللہ عنہ کی سیرت پاک میں یہ فخر اس خاندان میں نمایاں ہوتا ہے:۔

اذا دولةُ القرآن كانت ارومتي — وقام مقامي عالمٌ بعد عالمِ

حب کلام اللہ میرا قبیلہ و خاندان ہوا، اور ہمیشہ خاندان میں ایک عالم کے بعد دوسرا عالم

میرا قائم مقام ہوتا رہا)۔

تواضعتُ للهِ الکریم اذ تناولت یدای الثریا قاعداً غیر قائم

(تو میں اللہ کے لیے اور بھی جھک گیا، تواضع اختیار کر لی، کہ اس نے اتنی بڑی نعمت بخشی کہ میرے ہاتھوں نے بیٹھے بیٹھے ثریا کو پا لیا، کھڑے ہونے کی نوبت تک نہ آئی)۔

الحمد للہ کہ آل عماد میں یہ نعمت آج تک مستقیم اور یہ انداز اب تک قائم ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشان است

خم وخمخانہ با نام ونشان است

مجالس ذکر میں حضرت نے آیات الٰہی کے "وقتاً فوقتاً" جو مطالب متعین فرمائے ہیں مستفیدین ان کا املا کرتے رہے، اور ان امالی کے اجزا آج بھی چشمِ تحقیق کے لیے بصیرت افروزی کے روشن ترین جلوے اپنے اندر رکھتے ہیں، حضرت کی زبان عربی تھی، یہ امالی بھی عربی ہی میں ہیں، اردو میں یہ پہلی تلخیص ہے جو ترجمان القرآن کے لیے کی جا رہی ہے، امتداد نے اس طومار کو جا بجا کرم خوردہ کر رکھا ہے ایسے مقامات پر بجائے نقل عبارت کے سیاق سے جو مفہوم متعین ہو سکتا تھا اسی پر قناعت کرنی پڑی۔

مبادا کہ ایں گوہر آید بسر

الاستقامۃ فوق الکرامۃ استقامت کیا ہے اور کیوں اس کو فوق الکرامۃ کہا گیا ہے؟ اس باب میں حضرت نے سورہ حٰم السجدہ کی اس آیۂ کریمہ کی تفسیر فرمائی:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے
تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا	پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے، کہ تم اندیشہ نہ کرو
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ	اور نہ رنجیدہ ہو، خوش رہو کہ اس بہشت کی تمہیں بشارت
کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ، نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ	ہوئی جس کے وعدے تم سے ہوا کرتے تھے دنیا و آخرت

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا	ان دونوں زندگیوں میں ہمیں تمہارے ساتھی ہیں
تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَ لَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ	یہاں جو تمہارا جی چاہے حاضر اور جو مانگو مہیا ہے،
نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۔	یہ ایک طرح کی ضیافت ہے ایک غفور الرحیم کی جانب سے
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ	کون اس سے بہتر اور کس کی بات اس سے اچھی ہو سکتی
صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔	ہے جس نے اللہ کی طرف بُلایا اچھے اچھے کام کئے، اور
	اقرار کیا کہ میں اہل اسلام میں سے ہوں

اصناف کمال | فرمایا ۔

اِن الکمالات علی ثلاثۃ اقسام :-	کمال کی تین قسمیں ہیں ۔
النفسانیۃ وھی اشرفھا	کمال روحانی، اس کا سب سے اونچا درجہ ہے ۔
والبدنیۃ وھی اوسطھا	کمال جسمانی، اس کا درمیانی مرتبہ ہے ۔
والخارجیۃ وھی ادونھا	کمال خارجی، اس کی بالمقابل ادنی حیثیت ہے ۔
کمال نفس | والکمالات النفسانیۃ علی نوعین:	کمال روحانی کی بھی دو قسمیں ہیں :-
علم الیقین ۔	وہ علم جو مفید یقین ہو ۔
والعمل الصالح	اور وہ عمل جو صالح ہو ۔
فان کمال الانسان ان یعرف الحق لذاتہ	انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ "حق" کو محض حق ہونے کے لئے پہچانے
والخیر لاجل العمل بہ	اور "خیر" کو اس لیے پہچانے کہ ویسا ہی کام کرے ۔
معرفۃ الہی | وراس المعارف معرفۃ اللہ ،	سب سے بڑی اور سب سے اچھی پہچان اللہ کو پہچاننا ہے،
والیہا الاشارۃ بقولہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا	آیت "حقیقت میں جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار
رَبُّنَا اللّٰہُ ۔	اللہ ہی ہے" اسی جانب اشارہ ہے ۔

میانہ روی | وراس الاعمال الصالحة ان تستقيم في الوسط فلا تميل الى طرفيه الافراط والتفريط، واليه الاشارة في هذه الآية بقوله: ثم استقاموا

سب سے بڑا اور سب سے اچھا عمل صالح یہ ہے کہ تم بیچوں بیچ ٹھیک طرح قائم رہو، اس کے دونوں کنارے افراط و تفریط ہیں ان میں سے کسی کی طرف رخ نہ کرو۔ اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ "پھر وہ لوگ قائم رہے"

خدا کے اقرار کے ساتھ یقین اور معرفت لازم ہے | ولما كان قوله تعالى ان الذين قالوا ربنا الله يمكن حمله على القول باللسان فقط عقبه بقوله: ثم استقاموا، فعلم ان ذلك لا بد له من ان يكون مقرونا باليقين التام والمعرفة الحقيقية

اللہ تعالی کا یہ فرمانا کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اس بات کو صرف زبان سے بھی کہہ دینے پر محمول کر سکتے تھے، لہذا اس کے بعد فرمایا پھر وہ مستقیم بھی ہو گئے، اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ زبان سے جو کچھ کہا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ یقین کامل اور معرفت حقیقی کے ساتھ کہا جائے۔

شان نزول | وقد نزلت هذه الآية في سيدنا ابي بكر رضي الله عنه حينما وقع في انواع شديدة من البلاء والمحنة ولم يتغير عن دينه.

یہ آیت ہمارے جد بزرگوار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں اُس وقت نازل ہوئی تھی جب آپ طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں میں پڑے اور پھر بھی ذرہ برابر اپنے دین سے نہ ہٹے۔

فكان هو الذي قال: ربنا الله، وبقي مستقيما عليه لم يتغير بسبب من الاسباب

گویا ابوبکر صدیقؓ ہی نے یہ کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، اور پھر اس بات پر ایسے مستقیم اور ثابت رہے کہ کسی طرح بھی اس اعتقاد اور اس پر عمل میں کوئی تغیر نہ ہونے دیا

غلو سے بچنا | فمن اقر بالله يجب عليه ان لا يتوغل جانب النفي ولا في الاثبات بل يبقى

جس نے اللہ کے پروردگار ہونے کا اقرار کیا اس پر لازم ہے کہ نفی و اثبات دونوں میں حد سے نہ بڑھے بلکہ خط

على الخط المستقيم الفاصل بين طرفي التعطيل	مستقیم پر قائم رہے جو تعطیل (یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک
والتشبيه والجبر والقدر والرجاء	صفت میں مخلوقات کے مشابہ سمجھنا) اور جبر و اختیار
والقنوط ونحوه ۔	اور امید و ناامیدی وغیرہ کے درمیان ایک حد فاصل ہے
اقرار ربوبیت و عمل صالح | والاستقامة محمولة	استقامت کو اعمال صالحہ پر محمول کرنا چاہیے کہ اچھے اچھے
على الاتيان بالاعمال الصالحة	کام کریں کرتے رہیں، اور کبھی اس میں تغیر نہ ہونے دیں
فقوله تعالى ۔ ان الذين قالوا ربنا	آیہ شریف "جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ
الله متناول للقول والاعتقاد	ہی ہے" اس میں کہنے کی بات قول و اعتقاد دونوں کو
	شامل ہے ۔
وقوله : ثم استقاموا متناول للاعمال	"پھر اس پر قائم رہے" یہ تمام اعمال صالحہ پر حاوی
الصالحة ۔	ہے ۔
رعایت مصلحت | فرمایا :۔	
ان الغاية في رعاية المصالح دفع المضار	مصلحت بینی و مصلحت شناسی میں خاص بات یہ ہے
وجلب المنافع، ودفع المضرة اولى	کہ مضرتیں دفع ہوں اور منفعتیں حاصل کی جائیں ؟
بالرعاية من جلب المنفعة ۔	حصول منفعت پر بھی دفع مضرت مقدم ہے ۔
والمضرة اما ان تكون حاصلة في	حصول مضرت کا امکان یا تو زمانہ مستقبل میں ہے ۔ یا
المستقبل او في الحال او في الماضي ۔	حال میں یا ماضی میں ۔
والمستقبل المقدم على الحاضر والحاضر	مستقبل حال پر مقدم ہے اور حال کو زمانہ ماضی
مقدم على الماضي ۔	پر تقدم حاصل ہے ۔
فان الشئ الذي لم يوجد ويتوقع	کوئی شئے جب تک موجود نہیں مگر ہونے کی توقع ہے ۔

حدوثه يكون مستقبلاً، فاذا وُجد يصير حاضراً فاذا انعدم يصير ماضيا

ہنوز زمانہ مستقبل میں ہے جب موجود ہوگئی تو زمانۂ حال میں آگئی اور جب جاتی رہی تو ماضی بن گئی۔

فالمضار التي يتوقع حصولها في المستقبل اولى بالدفع من المضار الماضية

جو مضرتیں زمانۂ مستقبل میں حاصل ہونے والی ہوں ان کو دفع کرنا زمانۂ ماضی کی مضرتوں کے دفع کرنے پر مقدم ہے

خوف وحزن | والخوف عبارة عن تألم القلب بسبب توقع حصول مضرة في المستقبل و الحزن عبارة عن تألم القلب بسبب فوت نفع كان موجوداً في الماضي فدفع الخوف اولى من دفع الحزن۔

خوف یہ ہے کہ کسی آیندہ ضرر ہونے کی توقع سے دل کو رنج پہونچے، اور حزن یہ ہے کہ کوئی نفع جو زمانہ ماضی میں حاصل تھا۔ اس کے فوت ہوجانے سے قلب رنجیدہ ہو، اس بنا پر خوف کا دفع کرنا حزن کے دفع کرنے پر مقدم ہے۔

آیت کے مدارج ترتیبی | وقد اخبر الله عن ملائكته انهم في الاول الامر يخبرون بانه لاخوف عليكم بسبب ما تستقبلون من احوال القيامة

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کی نسبت آگاہ فرمایا ہے کہ وہ پہلے پہل مسلمانوں کو یہ خبر دیں گے کہ آگے چل کر قیامت میں جو حالات پیش آنے والے ہیں تم ان کا خوف نہ کرو۔

ثم يخبرون بانه لاحزن عليكم بسبب ما فاتكم من احوال الدنيا۔

پھر یہ کہیں گے کہ دنیا کے جو حالات فوت ہوگئے وہ تمہارے حق میں حزن کا سبب نہیں۔

وعند حصول هذين الامرين زالت المضار والمتاعب كلها۔

جہاں یہ دونوں باتیں حاصل ہوئیں کہ تمام مضرتیں اور اذیتیں جاتی رہیں۔

وبعد الفراغ منه يبشرون بحصول المنافع وهو قوله تعالى: وابشروا

اس سے فراغت ہونے پر حصول منفعت کی بشارت دیں گے، یہی مدعا آیۂ کریمہ کا ہے کہ "تمہیں اس جنت

بالجنة التی کنتم توعدون۔　　　　کی بشارت ہو جس کے وعدے تم سے ہوتے تھے۔

اللہ ہی مولیٰ ہے فرمایا۔

نحن اولیاءکم۔ ہم تمہارے ولی ہیں مفسرین اس قول کو فرشتوں سے منسوب کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے وہ اس طرح خطاب کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔

انما ولیکم اللہ　　　　تم سب کا ولی اور والی اللہ ہی ہے۔

اللہ ولی الذین امنوا۔　　　　جو ایمان لائے ان کا ولی اور والی تو اللہ ہی ہے

ذلک بان اللہ مولی الذین امنوا وان الکفرین　　　　یہ اس لیے کہ جو ایمان لائے ان کا والی تو اللہ ہی ہے

لا مولی لھم۔　　　　اور کافروں کا تو کوئی بھی والی نہیں۔

اللہ جن کا والی ہو، فرشتے اپنے آپ کو ان کے ولی کی حیثیت میں کیوں کر پیش کر سکتے ہیں؟

فرشتوں کی بات گذر چکی یہاں سے اللہ کی بابت شروع ہوتی ہے۔

مسلمان کی دنیا و آخرت فرمایا:۔

نزول ملائکہ لوگوں کی رائے میں پیغمبروں ہی تک محدود ہے بے شبہہ یہ تحدید ایک حد تک صحیح ہے فرشتے پیغمبروں کے پاس آتے ہیں تو اللہ کی جانب سے وحی اور شریعت لاتے ہیں، عامۂ مومنین اس شرف میں شریک نہیں۔

لیکن مومنین مخلصین میں جو مستقیم الحال ہیں ان پر بھی فرشتے نازل ہوتے ہیں، انھیں خوف و حزن سے تسکین و تسلی دلاتے ہیں، اور بہشت موعود کی بشارت دیتے ہیں ملائکہ اُن پر اترتے ہیں کہ خوف نہ کرو، محزون نہ رہو، تو تمھیں اس جنت کی بشارت ہے جس کے وعدے تم سے ہوا کرتے تھے۔۔۔۔

لہ کاغذ کرم خوردہ، عبارت جابجا غیر مقروء، سوق کلام مبنی بر سیاق ہے۔

لہ کاغذ کرم خوردہ، عبارت جابجا غیر مقروء، سوق کلام مبنی بر سیاق ہے۔

۔ یہاں جو تمہارا جی چاہے حاضر اور جو مانگو مہیا ہے" مفسرین اس وعدے کو بہشت آخرت سے موعود سمجھتے ہیں، لیکن جب اس سے پہلے حیاۃ دنیا و آخرۃ دونوں کا تذکرہ ہے تو کیا یہ وعدہ دونوں کی نسبت نہیں ہو سکتا؟

ممکن ہے اس دنیا میں ایک انسان کی تمام آرزوئیں پوری نہوں، لیکن حقیقت ہے کہ ایک مسلمان کی تمنائیں بر نہ آئیں۔

تعلق جسمانی مانع عروج آسمانی | فرمایا۔

ان جوھر النفس کالشعلة بالنسبة الی الشمس والقطرة الی البحر۔	جوہر روح کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب کی نسبت سے ایک شعلہ اور سمندر کی نسبت سے ایک قطرہ۔
والتعلقات الجسمانیة هی التی تحول بینها وبین السماء، کما قال صلی اللہ علیہ وسلم	آسمان تک روح کے عروج کرتے میں جسمانی تعلقات حائل ہیں، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں
لولا ان الشیٰطین یحومون علی قلوب بنی آدم لنظروا الی ملکوت السمٰوٰت	بنی آدم کے دل کے آس پاس شیطان پھرا نہ کرتے تو آسمانوں کی بادشاہی انسانوں کو بھی نظر آتی :
فاذا زالت العلائق الجسمانیة والتدبیر البدنیة فقد زال الغطاء	جسم کے علاقے اور بدن کی تدبیریں جہاں زائل ہوئیں کہ یہ حجاب حائل بھی اٹھ گیا۔
فیتصل الاثر بالموثر والقطرة بالبحر والشعلة بالشمس	اس حالت میں اثر اپنے موثر سے، قطرہ دریا سے اور شعلہ آفتاب سے جا ملے گا۔
فھذا ھو المراد من قوله: نحن اولیاءکم فی الحیاۃ الدنیا وفی الاخرۃ۔	"اس دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمہارے ولی ہیں،، اس آیت سے یہی مراد ہے۔
اللہ کی ضیافت | ثم قال: نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ	اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہ سب ایک طرح

والنزل رزق النزیل وهو الضیف فکل هذه السعادات المذکورة جاریة مجری النزل والکریم اذا اعطی النزیل یتبعه بالخلع من بعده وهی رضوانه جل شانه ورضوان الله اکبر۔

کی ضیافت ہے ایک غفور الرحیم کی طرف سے "نزیل" مہمان کو اور نزل اس کی تواضع اور ضیافت کو کہتے ہیں یہ تمام سعادتیں جن کا بیان اس آیت میں ہے ایک طرح کی ضیافت کا حکم رکھتی ہیں، شریف جب کسی کی ضیافت کرتے ہیں تو اس کے بعد خلعت سے بھی سرفراز فرماتے ہیں، یہاں رضائے الٰہی کا خلعت ہوگا کہ یہی سب سے بڑھ چڑھ کے ہے۔

مرتبۂ سعادت فرمایا :-

مراتب السعادت اثنان — سعادت کے دو درجے ہیں :

التام — وہ جو کامل ہو۔

وفوق التام — وہ جو اس سے بھی بڑھ کے ہو۔

اما التام فهو ان یکتسب من الصفات الفاضلة ما لاجلها یصیر کاملاً فی ذاته فاذا صعد الی هذه الدرجة اشتغل بتکمیل الناقصین وهو فوق التام۔

کامل سعادت یہ ہے کہ ایسی فضیلت کے اوصاف حاصل کیے جائیں جن سے انسان بذاتہ کامل ہو جائے جب اس درجہ پر انسان پہنچ گیا تو ناقصوں کو کامل بنانے کی جانب مشغول ہونے کا وقت آیا کامل سعادت سے بھی یہ سعادت بڑھی ہوئی ہے۔

اپنے آپ کو کامل بنانا

فقوله: ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا اشارة الی المرتبة الاولی وهی اکتساب الاحوال التی تفید کمال النفس فی جوهرها۔

آیۂ کریمہ "جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے" اس میں پہلے مرتبہ کی جانب اشارہ ہے یعنی ایسے حالات کا حاصل کرنا جن سے جوہر روح کامل ہو سکے،

قوم کو درجۂ کمال پر پہونچانا

فاذا اتّصفت النفس بها وجب الانتقال الى المرتبة الثانية وهي الاشتغال بتكميل الناقصين

جب یہ مرتبہ حاصل ہوگیا تو اس سے آگے بڑھنے اور دوسرا مرتبہ حاصل کرنے کی لازمی ضرورت پیش آئی، یعنی ناقصوں کو کامل بنانے کا کام۔

دعوت اسلام کے یہی معنی ہیں

وذالك انما يكون بدعوة الخلق الى الدين الحق، وهو المراد من قوله: ومن احسن قولاً ممن دعا الى الله۔

یہ دوسرا درجہ اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ خلق اللہ کو دین حق کی دعوت دیجائے، آیۂ کریمہ "اس سے اچھا کون ہے اور اس کی بات سے کس کی بات اچھی ہے جس نے اللہ کی جانب دعوت دی" اس سے یہی مراد ہے۔

تقریظ وانتقاد

"اسلام اور اشتراکیت"

یہ ۱۲۰ صفحہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کو حاجی محمد یوسف صاحب احمد پانی، دہلی نے چھپوا کر مفت تقسیم کیا ہے۔ اس کے مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کوئی ایسا شخص ہے جس نے اشتراکیت (کمیونزم) کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے ساتھ اسلام کے اصول دین اور اس کے سیاسی تمدنی ور معاشی نظام کو بھی خوب سمجھا ہے۔ درحقیقت یہ بحث اس قابل تھی کہ اس پر ایسا ہی شخص قلم اٹھاتا، کیونکہ جو لوگ اسلام کے اصول سے ناواقف ہیں وہ اشتراکیت کے خوشنما پہلوؤں سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اور چند سطحی مشابہتیں دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں، بلکہ اسلام خود بھی "اشتراکی" ہے، اور اشتراکیت بہت قریب کی راہ سے اسلام کی طرف آرہی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اسلام کا علم تو رکھتے ہیں، مگر اشتراکیت سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ صحیح طور سے نہیں بتا سکتے کہ ان دونوں مذہبوں میں اصولی اختلافات کیا ہیں، اور کن وجوہ سے اشتراکیت ایک مردود مذہب ہے۔ پروپیگنڈا کی طاقت، اور اُس عملی کامیابی نے جو اشتراکی مذہب کو بظاہر روس میں حاصل ہوئی ہے، اس کو جدت پسند نگاہوں کے لیے اتنا مزین بنا دیا ہے کہ ہر وہ شخص جو سوسائٹی کے موجودہ نظام سے غیر مطمئن ہے، اشتراکیت پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی اشتراکی خیالات تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں کیونکہ عام تعلیمیافتہ حضرات تو اسلام اور اشتراکیت دونوں پر کوئی عمیق نظر نہیں رکھتے، اور خواص اگرچہ اشتراکیت کی حقیقت اور اس کی فاسد بنیادوں کو جانتے ہیں، مگر اسلام سے ناواقف ہیں، اس لیے اس غلط

فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ تمدن و معیشت کی موجودہ مشکلات کا کوئی حل اشتراکیت سے بہتر نہیں۔ اس بڑھتی ہوئی انقلابی رو سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں اشتراکی مذہب جس کو محض ایک معاشی و اقتصادی مذہب سمجھا جا رہا ہے، اپنے ان اُصول و قواعد کے ساتھ مسلمانوں میں بھی جڑ نہ پکڑ لے، جو کلیتہً دہریت، مادہ پرستی اور لادینیت پر مبنی ہیں، اور اخلاق و انسانیت کی تمام صالح بنیادوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں علمائے اسلام نے اس خطرۂ عظیم کو ابھی تک محسوس نہیں کیا ہے، اور یہ فتنہ غیر محسوس طور پر پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام اور اشتراکیت کے مصنف کی یہ کوشش ہمارے دلی شکریہ کی مستحق ہے کہ انہوں نے ایک ایسا مرقع تیار کر دیا جس میں لوگ بیک نظر اسلام اور اشتراکیت کی حقیقی تصویریں پہلو بہ پہلو دیکھ سکتے ہیں اور خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کونسی تصویر اس قابل ہے کہ ایک صاحب عقل انسان اس کا گرویدہ ہو۔

مصنف نے پہلے مختصراً اشتراکیت کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے بعد وہ اصول بیان کیے ہیں جن پر یہ مذہب قائم ہوا ہے اور اس سلسلہ میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ اشتراکی مذہب بالکلیہ ایک سلبی اور تخریبی مذہب ہے۔ دین، اخلاق، معاشرت، معیشت اور حکومت، ہر چیز کے نظام کو درہم برہم کر دینا اس کا اصل مقصود ہے، اور ان سب چیزوں کو مٹا کر وہ انسان کو ایک ایسی حالت کی طرف لے جانا چاہتا ہے جس میں انسانیت سراسر حیوانیت اور بہیمیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر انہوں نے اسلام کے معاشی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی نظام کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اشتراکیت کے اصولوں سے اس کا مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے کہ ان دونوں مذہبوں میں ایسے بنیادی اختلافات ہیں جن کی بنا پر نہ کوئی مسلمان جب تک وہ مسلمان ہے اشتراکی ہو سکتا ہے، اور نہ کوئی اشتراکی، مارکس اور لینن کے نظریات پر ایمان رکھتے ہوئے مسلمان بن سکتا ہے۔ اشتراکیت اور اسلام کے موازنہ سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ تمدن اور معیشت و سیاست کی جن خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اشتراکی مذہب ایجاد کیا گیا ہے، اسلام ان سب کا علاج کر دیتا ہے، مگر فرق یہ ہے کہ اسلام نے اصلاح و تعمیر کا طریقہ اختیار کیا ہے، اور اشتراکیت سراسر افساد و تخریب کے طریقوں سے کام لیتی ہے۔ اسلام مرض کا

علاج اس طرح کرتا ہے کہ مریض تندرست ہو جائے۔ اور اشتراکیت اس کا علاج اس طرح کرتی ہے کہ نہ مرض رہے نہ مریض۔ اسلام سوسائٹی کے بگڑے ہوئے نظام کو حکمت کے ساتھ مٹاتا ہے، اور اس کی جگہ ایک صالح نظام قائم کر دیتا ہے؛ مگر اشتراکیت اس کو ظلم و جور سے مٹاتی ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا فاسد نظام قائم کرتی ہے جو سرمایہ داری، بادشاہی، اور پاپائیت کی بدترین خرابیوں سے زیادہ خرابیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔

فی الجملہ یہ مختصر رسالہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو اشتراکیت کو محض دور سے دیکھ کر اس کی ظاہر فریب صورت پر مائل ہو رہے ہیں لیکن جن لوگوں نے اس نئے مذہب کا زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ان کے خیالات کی اصلاح کے لیے اتنی سرسری بحث کافی نہیں ہو سکتی۔ اس غرض کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں اشتراکیت کی بیخ کی جائے، اس کے فلسفہ، اور اس کے نفسیات کا کھوج لگایا جائے اور ان اسباب کی تحقیق کی جائے جنہوں نے اشتراکی مذہب کو ایسا بنا دیا اور اسے سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ دیانت، اخلاق اور نظم اجتماعی کا بھی دشمن بنا دیا پھر اشتراکی اصولوں پر نہ صرف عقلی اور علمی حیثیت سے تنقید کی جائے، بلکہ عملی زندگی میں ان اصولوں کے نفاذ سے جو نتائج رونما ہوئے ہیں ان پر بھی ایک تفصیلی نظر ڈال کر دکھایا جائے کہ یہ اصول کس حد تک ناقابل عمل ہیں؟ اور اگر کسی حد تک قابل عمل ہیں بھی تو انسانیت کے لیے کس قدر نقصان رساں ہیں۔ بخصوصیت کے ساتھ جو مسئلہ سب سے زیادہ توضیح کا طالب ہے وہ یہ ہے کہ اشتراکیت کی بنیاد میں دہریت اور مادہ پرستی کس طرح داخل ہو گئی، حالانکہ ابتدا میں یہ تحریک صرف نظام سرمایہ داری کے خلاف ایک بغاوت تھی، اور اس کا مقصد محض معاشی مشکلات کو حل کرنا تھا؟ اس کے لیے مصنف کو مذہب کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ پر ایک عمیق نظر ڈالنی ہوگی اور ان خطوط کا سراغ لگانا پڑیگا جن پر گذشتہ تین چار صدیوں سے مغربی تہذیب ترقی کرتی رہی ہے۔ اس تحقیق و تفتیش سے یہ راز منکشف ہو جائے گا کہ مذہب و سائنس کا جو معرکہ سولھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، وہ جس نے ترقی کر کے انیسویں صدی میں شدید نیچریت Naturalism اور مادیت Materialism کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کا فطری نتیجہ وہی افکار و نظریات ہیں جن سے بولشوزم کا خمیر تیار ہوا ہے۔ بولشوزم

محض ایک معاشی مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ تہذیب جدید کے شجر خبیث کا پختہ ثمر ہے۔ یورپ میں اس درخت کے جو ثمرات نمودار ہوئے ہیں وہ ابھی پختگی کو نہیں پہنچے ہیں۔ یورپ والوں کے دل و دماغ میں ابھی تک وہ اعتقادات اور اخلاقی اصول اور تمدنی نظریات بسے ہوئے ہیں جو ان کو مسیحیت سے وراثتاً ملے ہیں، اسی وجہ سے وہ اپنی خالص مادی تہذیب میں بھی مذہبیت، اخلاق اور معاشرت کی قدیم خصوصیات کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، درآں حالیکہ دونوں کے مزاج میں بنیادی اختلاف ہے، اور ان دونوں کا امتزاج ان کی عین فطرت کے خلاف ہے۔ اشتراکی روس نے اس غیر فطری امتزاج کا کلیۃً خاتمہ کر دیا، اور وہاں وہ تہذیب اپنے کمال طبیعی کو پہنچ گئی جس کی تعمیر سراسر مادہ پرستی اور نیچریت کی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ نیچریت خدا پرستی کی ضد ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان کی حیثیت ایک مستقل بالذات مشین سے زیادہ نہیں ہے، اخلاقی تصور کے لیے اس کے حدود میں کوئی گنجائش نہیں۔ انسانیت کی لطیف خصوصیات سب کی سب اس کے نزدیک بے معنی ہیں۔ صدق و کذب، حسن و قبح اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معیار اس کے پاس نہیں۔ وہ اعمال کو محض ان کے محسوس نتائج کے اعتبار سے جانچتی ہے، اور اسی لحاظ سے ان کی قدریں متعین کرتی ہے، کامیابی اور حیوانی اغراض کا حصول اس کا منتہائے مقصود ہے اور اس کے لیے وسائل میں جائز و ناجائز کے درمیان فرق کرنا نیچری اصول کے مطابق کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ اس دائرہ میں جواز و عدم جواز کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیات ہر اس تہذیب میں ضرور پائی جانی چاہئیں جس کی بنیاد نیچریت اور مادہ پرستی پر رکھی گئی ہو۔ یورپ میں یہ تہذیب ابھی خام ہے۔ روس میں اسے پختگی حاصل ہو گئی ہے، اور پندرہ بیس سال کی مختصر مدت ہی میں اس نے ثابت کر دیا ہے کہ جو نظام تمدن خالص نیچری بنیادوں پر قائم ہوتا ہے وہ انسان کے لیے دنیا کو کس طرح دوزخ بنا دیتا ہے۔

مکتبۂ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلباء کے لئے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مؤلفین حیدرآباد میں اپنی تصنیفات کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعراء اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر فہرست مفت طلب ——— مالک خواجہ بہاء الدین صاحب مکتبہ علمیہ چارمینار حیدرآباد دکن ——— فرمایئے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتداء میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی اُن کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابو الاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کون سی کتابوں سے خالی ہے

اس کا جواب ان الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اس کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہ راہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتبخانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرہ پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتب خانہ کو دیکھیے اور اس میں جو کمی ہو اس کو پورا کرنے کیلیے ہمارے کتب خانہ کو دیکھیے جہاں عربی فارسی اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی، ادبی، تاریخی و فنی جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش و جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں درسی کتابیں منظور شدہ سر رشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی۔ اے کلاس بزبان عربی۔ فارسی۔ اردو انگریزی۔ مرہٹی تلگو کنڑی وغیرہ نیز کنڈر گارٹن، ماڈل کے منٹ و نقشہ جات دیواری رنگین ہر قسم کے چارٹس اسباق الاشیاء، وغیرہ مدارس کے اور دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل واجبی قیمتوں پر حاصل کیجیے۔

سید عبدالقادر تاجر کتب

و مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چار مینار حیدرآباد دکن